بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۳ ۲۵؍جولائی ۲۰۲۶ء مطابق ۱۰؍صفر المظفر ۱۴۴۸ھ شمارہ نمبر ۱۸

اس شمارے میں

شعروادب	عزیزؔ صفی پوریؒ، اختر شیرانیؒ	۴
''...ولاھامۃ ولا صفر''	شمس الحق ندوی	۵
آخرت پر یقین اور فلاح یاب لوگ	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۷
توحید، توکل اور تدبیر	مولانا عبدالرشید راجستھانی ندوی	۸
سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۹
اسناد اور درس گاہوں کی اصطلاحیں	حضرت مولانا عبداللہ عباس ندویؒ	۱۰
اعتدال کا راستہ	حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی	۱۲
مزاحِ نبویؐ کے تربیتی پہلو	مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی	۱۴
حسد اور غیبت-دل کا ناسور	مولانا محمد شاہد ناصری حنفی	۱۶
اشتراکیت-ایک ناکام نظام معیشت وسیاست	مولانا انیس احمد ندوی	۱۸
استغفار کے برکات وفضائل	مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی	۲۰
تھے تو وہ آبا تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟	مولانا محمد ناظم اشرف ندوی	۲۲
فکر وعمل کی تشکیل میں عقیدہ کی اہمیت	مولانا محمد وثیق ندوی	۲۳
جرائم کا بڑھتا رجحان	مولانا محمد رافع ندوی	۲۶
دعوتِ انبیاء اور مخالفین کی نفسیات	مولانا عبدالسبحان ناخدا ندوی	۲۷
انسانی زندگی کا عظیم ترین سرمایہ	محمد جاوید اختر ندوی	۳۰
تعارف وتبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۳۱
عروجِ امت کا راز	محمد نفیس خان ندوی	۳۳

سرپرست

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

نائب مدیر

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

محمد نفیس خان ندوی ❁ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❁ مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرِ تعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT
Tagre Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Call : 9559844716
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/500	فی شمارہ -/25	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔ $100

ڈرافٹ مینجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر ₹30/= جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (مینجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کراکے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر وادب

حق تعالیٰ کی اطاعت ہے اطاعت تیری

نتیجۂ فکر: مولانا عزیز اللہ عزیز صفی پوریؒ

مصحف پاک ہے کونین میں حجت تیری
حق تعالیٰ کی اطاعت ہے اطاعت تیری

کنت کنزا سے ہویدا ہے حقیقت تیری
نورِ بے کیف کا آئینہ ہے صورت تیری

جس نے دیکھا تجھے اللہ کو پہچان لیا
سرِّ توحید بعثت ہے رسالت تیری

انبیاء سب ترے میثاق پہ مبعوث ہوئے
حق کے نزدیک مقدم ہے شہادت تیری

مغفرت کیوں نہ کرے مل کے مداوا اس سے
جس کی تقدیر میں لکھی ہے شفاعت تیری

آشکارا ہوئی آدم کی حقیقت تجھ سے
جس طرح کنت نبیا سے حقیقت تیری

ہر رگ و پے میں سماتی ہے تجلی بن کر
جان لیتی ہے عجب ڈھب سے محبت تیری

کرلیا اپنی طرف، محو کیا دونوں کو
دل پہ احسان ہے اور آنکھ پہ منت تیری

جسم و جاں کو تری ہستی نے عطا کی ہستی
دونوں عالم میں سماتی نہیں ہستی تیری

نورحق کیوں نہ سما جائے ترے دل میں عزیزؔ
کیسے محبوب پہ آئی ہے طبیعت تیری

شمع فروزاں

نتیجۂ فکر: اختر شیرانی مرحوم

مسند نشین عالم امکاں تمہی تو ہو
اس انجمن کی شمع فروزاں تمہی تو ہو

دنیائے ہست و بود کی زینت تمہی سے ہے
اس باغ کی بہار کا ساماں تمہی تو ہو

روشن ہے جس کی ضو سے شبستانِ زندگی
وہ ماہِ نیم، ماہِ درخشاں تمہی تو ہو

دنیا کی آرزو میں فنا آشنا ہیں سب
جو روحِ زندگی ہے وہ ارماں تمہی تو ہو

تم کیا ملے کہ دولت ایماں ملی ہمیں
ایمان کی تو یہ ہے کہ ایماں تمہی تو ہو

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ہے جس کا نور
وہ جلوہ زارِ حسنِ درخشاں تمہی تو ہو

وارائے چرخ و دور زمیں جس کے ہیں غلام
وہ نازِ دہر و نازشِ دوراں تمہی تو ہو

دنیا و آخرت کا سہارا تمہاری ذات
دونوں جہاں کے والیٔ و سلطاں تمہی تو ہو

شادابیٔ صنوبر و نسریں تمہی سے ہے
بوئے گل و بہارِ گلستاں تمہی تو ہو

اخترؔ کو بے نوائی دنیا کی فکر کیا
ساماں طرازِ بے سر و ساماں تمہی تو ہو

اداریہ

"...ولا ھامۃ ولا صفر"

شمس الحق ندوی

انسانیت کی مذہبی تاریخ کا اک سرسری جائزہ لینے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انسانیت کے گمراہ ہونے کی چند بنیادی وجوہ ہیں:

اول: وحی کا 'فترۃ' طویل ہوجانا، جو حق کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے۔ دینِ الٰہی' زمانہ کی دست برد کا شکار ہوچکا ہے، اور اب حضرتِ انسان کو صرف اپنی عقل وادراک سے حق تک رسائی حاصل کرنی ہے......تو پھر ان کی یہ چھوٹی سی عقل جو 'علمِ قلیل' سے زیادہ اپنے اندر وسعت نہیں رکھتی' اتنی ہی پرواز کرپاتی ہے کہ وہ کسی بھی غیر معمولی مخلوق کو، جو انسانی زندگی کے لیے انتہائی خطرہ یا منفعت کا سبب بن سکتی ہے' اپنے 'رب' کے طور پر اختیار کرلیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں نجوم وکواکب کی پرستش کی گئی، فرشتوں کو دیویاں بنایا گیا، پہاڑوں اور دریاؤں کی پوجا کی گئی، یہاں تک حیوانات کے سامنے سرِ عقیدت خم کیا گیا۔ پچھلی امتوں کو اسی عقلِ نارسا نے ہلاک وبرباد کیا۔

دوم: وحی موجود ہے، اللہ کی کتاب اور رسول کا فرمان موجود ہے؛ لیکن ہوائے نفس نے ان میں وہ کتر بیونت کیا، اور مادیت نے حرص وہوس کے وہ گل کھلائے کہ آسمانی مقدس علم' جہل وضلالت کی تہ بہ تہ پرتوں میں چھپ کر رہ گیا، اور دینِ خداوندی کی شکل وہیئت مسخ ہوکر رہ گئی۔ اب لاکھ اصلاح کا برش چلایئے؛ لیکن وہ صحیح تصویر ابھر کر کینوس پر آ ہی نہیں سکتی جو حقیقی تھی، اور خوبصورت بھی؛ چنانچہ انسانوں کو خدا بنالیا گیا اور انبیاء ومرسلین کی زندگی کو نمونہ واسوہ بنانے کے بجائے ان کی کردارکشی کی گئی، اور پھر راستہ صاف......، ہوس کے بندوں نے خوب حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا، رشتوں کو رسوا اور حقوق کو پامال کیا، اور انسانی معاشرہ کے لیے وہ نظام ودستورِ حیات طے کیا کہ حیوانات بھی شرماجائیں۔

سوم: وحی موجود ہے، اور اپنی اصلی حالت میں موجود ہے، رب کائنات نے اس بار اپنی جانب سے 'اتمامِ نعمت' فرمادیا ہے؛ اپنی کتاب میں ہر قسم کی تحریف سے حفاظت کا وعدہ فرمالیا ہے، اور اس کے عملی نمونہ' حیاتِ رسول' کو اربابِ ثقاہت اور اصحابِ عدالت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہاتھوں مدون کرادیا ہے؛ لیکن اب بھی ابلیسِ ملعون نے ابنِ آدم کی تباہی ورسوائی کے لیے وہ طریقے ڈھونڈھ لیے جو اس کے مشن اور چیلنج کو کامیاب بناسکیں۔

اب امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام بھی تین ابلیسی پھندوں کا شکار ہے۔ شخصیت وخاندان، زمان اور مکان۔

قرآن وحدیث کی موجودگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو گرچہ عزیر وعیسی علیہما السلام کی طرح خدا کا درجہ تو نہیں دیا گیا؛ لیکن آپ کی ذاتِ گرامی کو بشریت کے دائرہ سے نکالنے کی کوششیں خوب ہوئیں، آپ علیہ السلام کے اہلِ خانہ، اہلِ بیت کرام کے سلسلہ میں غلو سے کام لیا گیا، آپ علیہ السلام، اہلِ بیت کرام اور امت کے شہداء وصالحین اور اولیاء ومتقین کے بارہ میں ایسا مبالغہ آمیز رویہ اختیار کیا گیا کہ صریح الوہیت کا دعوانہ کرتے ہوئے بعض صفاتِ خداوندی میں ان کو شریک کرلیا گیا، اور لوگ غیر محسوس طور پر شرک میں مبتلا ہوئے، وہیں دوسری طرف اللہ کے بعض نیک بندوں سے نفور بھی پیدا ہوا، خود نبی علیہ السلام کی ذاتِ گرامی سے اہلِ کتاب کو، پھر اصحابِ نبیؐ سے خوارج اور اہلِ تشیع کو......۔

ابلیس کا دوسرا پھندہ 'مکان' کی قداست میں غلو پیدا کرنا ہے؛ روضۂ اقدس، اور اولیاء کے مزارات اور دیگر دینی مقدسات کے تئیں اللہ کے بندوں میں طے شدہ حد سے زیادہ حرمت اور تعظیم کا جذبہ پیدا ہونا' شرک وگمراہی کا ایک خطرناک جال ہے، جس نے نہ جانے کتنے امت کے افراد کو اپنے اندر لپیٹ لیا، اور حقیقی اسلام سے دور کر دیا؛ یہ روزمرہ کے مشاہد ہیں کہ حرمین میں لوگ تصویریں کھینچنے میں مصروف ہیں اور ان مقامات کے ادب واحترام کا خیال تک نہیں آتا، اور مزاروں پر خمیدہ جبینی، اور حد درجہ انکساری وعاجزی کا نمونہ بنے ہوئے ہیں، کل إناء یترشّح بما فیه۔

امتِ مسلمہ کی گمراہی کا ایک کھلا مظہر یہ بھی ہے کہ وہ بعض مبارک ایام اور بافضیلت مہینوں کے بارہ میں صحیح تصور نہیں رکھتے؛ پندرہ شعبان ہو، یا عاشوراء یا بارہ ربیع الاول، یا پھر محرم کا مہینہ۔ ان ایام کے بارہ میں ایسے تصورات وضع کر لیے گئے کہ نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کی تعلیمات میں جن کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان کے علاوہ تیجا اور چالیسواں، اور نہ جانے کیا کیا......، درحقیقت یہ 'زمان' کی شرعی حیثیت سے تغافل کی مثالیں ہیں، جنھوں نے ہمارے معاشرہ کو غیر اسلامی شکل دینے میں ایک بڑا کردار ادا کیا ہے۔

ذرا نبی کریم علیہ السلام کی تعلیمات پر نظر ڈالیں، فرماتے ہیں: "لاتجعلوا قبری عیدا، . . . و صلّوا علیّ و سلّموا حیثما کنتم"، دعا فرما رہے ہیں: "اللّٰھم لاتجعل قبری وثناً، لعن اللہ قوماً اتخذوا قبور أنبیاء ھم مساجد" (بخاری ومسلم)، ایک اور روایت میں ہے: "اللّٰھم لاتجعل قبری وثناً یعبد، اشتد غضب اللہ علی قوم اتخذوا قبور أنبیاء ھم مساجد" (موطا)۔ گویا آپ علیہ السلام کو قرآن وحدیث کی صریح تعلیمات کے بعد بھی اس بات کا اندیشہ رہا کہ امت شخصیت وخاندان پرستی اور 'مکانی غلو' میں ضرور مبتلا ہوگی۔

اسی طرح جہاں قرآن مجید میں 'اشہر حرم' کی تعظیم کا حکم دیا گیا، اور ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرنے کا حکم دیا: "إِنَّ عِدَّةَ الشُّھُوْرِ عِنْدَ اللهِ اثْنَا عَشَرَ شَھْراً فِیْ كِتَابِ اللهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَ الأَرْضَ، مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ، ذٰلِکَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ، فَلاتَظْلِمُوْا فِيْهِنَّ أَنْفُسَكُمْ"، اور حدیثِ پاک میں محرم کے مہینہ کو رمضان کے بعد روزوں کے اعتبار سے سب سے زیادہ بافضیلت قرار دیا، وہیں ہم غور کریں کہ کیا ہمیں 'أشھر حرم' کے آنے جانے کی خبر بھی ہوتی ہے، اور کیا محرم کو ہم روزہ رکھ کر گذار رہے ہیں، یا بدشگونی کا مہینہ سمجھ کر؟

احادیث طیبہ میں کسی وقت، کسی دن، کسی مہینہ کو مستقل منحوس یا بدشگوں قرار نہیں دیا گیا، اہلِ جاہلیت صفر کے مہینہ کو بدشگوں خیال کرتے تھے، تو فرمایا: "لاعدوی و لاطیرۃ، و لاھامۃ و لا صفر" (بخاری)، اوہام وخرافات کی ساری جڑوں کو کاٹ دیا گیا، اور کہہ دیا گیا کہ: تعدیٔ امراض، بدشگونی، بدروح اور صفر (کے مہینہ کی نحوست) کچھ نہیں۔ خیر وشر اور ان کے اوقات سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ جن ایام و شہور کی فضیلت وبرکت کا ذکر کتاب وسنت میں ہے، ان کے اعمال وکوائف کا بھی ذکر سیرتِ نبویؐ اور حیاتِ صحابہؓ میں موجود ہے، اور جن ایام کی نحوست کا ذکر کتاب وسنت میں آیا ہے تو ان کی نحوست مخصوص قوم کے مخصوص ایام تک محدود ہے، حق تعالی کا ارشاد ہے: "فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحاً صَرْصَراً فِیْ أَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ 'الآیۃ'، نبوی تعلیمات میں کہیں نہیں ملتا کہ ان ایام کی تحقیق کر کے ان میں شادی بیاہ و دیگر کاموں سے ممانعت کی گئی ہو۔

غرض یہ بنیادیں ہیں امت کی گمراہی کی، جنھوں نے کتاب وسنت کے محفوظ ہونے کے باوجود ہمارے دینی تشخص اور مذہبی سماج کو بدل کر رکھ دیا ہے، اور باطل مذاہب سے ایک گہرا رنگ چرا کر ہمارے 'دینِ حنیف' پر چڑھا دیا ہے۔

ماہِ محرم گذر چکا ہے، اور ماہِ صفر کا آغاز ہے، اہل جاہلیت صفر کو منحوس جانتے تھے، اور ہمارا ایک طبقہ محرم کو بدشگون سمجھتا ہے، امت مسلمہ کو عقل کے ناخن لینے کی ضرورت ہے، اور شخصیات ومقامات اور ایام وشہور کی نسبت اپنے تصورات کو قرآن وحدیث کی حدود اور تعلیمات کے دائرہ میں رکھنا چاہئے۔ وباللہ التوفیق وھو المستعان۔ ☆☆☆

تعلیم القرآن

آخرت پر یقین اور فلاح یاب لوگ

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء)

{وَبِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ}(البقرۃ:۴)۔

(اور آخرت کو یہی (لوگ) یقین جانتے ہیں)

متقین کی ایک اہم صفت یہ بیان کی گئی کہ وہ آخرت پر سو فیصد یقین رکھتے ہیں، ظاہر ہے جب اہل ایمان غیب کی باتوں پر یقین رکھنے والے ہوں گے، اقامت صلوٰۃ کا فریضہ انجام دینے والے ہوں گے، انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ رکھنے والے ہوں گے، شریعت کے ماننے والے ہوں گے، آسمانی کتابوں کے ماننے والے ہوں گے اور تمام کتابوں میں خاص طور پر قرآن مجید کے اندر آخرت کا بھرپور بیان ہے، اس کو بھی ماننے والے ہوں گے، تو کیا ان کتابوں کو مان لینے کے بعد آدمی کے اندر آخرت کا یقین پیدا نہیں ہوگا؟!

یہ تمام صفات ایک دوسرے سے مربوط ہیں، اگر آدمی کے اندر یہ صفات پیدا ہوں گی تو یقینی بات ہے کہ آخرت کا یقین پیدا ہوگا اور آخرت کا یقین جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے نتیجہ میں استحضار بھی بڑھتا ہے اور یہ دھیان پیدا ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن ہمیں جانا ہے اور حساب دینا ہے، یہ دنیا آزمائش کا گھر ہے، ہم وہاں جائیں گے تو ہمیں اس عمل کا حساب دینا پڑے گا، یہ ساری باتیں جب دھیان میں آئیں گی تو اس کے نتیجہ میں ان شاء اللہ آدمی کی زندگی تقویٰ والی زندگی بن جائے گی۔

{أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ}(البقرۃ:۵)۔

(وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے صحیح راستہ پر ہیں اور وہی لوگ اپنی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔)

عربی میں "فلاح" کا استعمال اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی اپنی مراد کو پہنچ جائے اور اپنے مقصد کو پالے، اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کی کامیابی کا راستہ اختیار کیا اور آخرت کی کامیابی کا راستہ ہی حقیقت میں "ہدایت" ہے اور وہ روشنی جو دل میں آتی ہے اس راستہ کی، اسلام کی، ایمان کی جس کے ذریعہ سے آدمی اپنے آپ کو کامیابی کے راستے پر ڈالتا ہے، وہ روشنی ہی ہدایت ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ مذکورہ صفات کو اختیار کرنے والوں سے بڑھ کر کون ہوگا؟! یہی لوگ صحیح راستے پر ہیں اور یہی لوگ اپنی مراد کو پہنچنے والے ہیں، یہاں جو نتیجہ گویا بیان کیا جارہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہی لوگ صحیح راستے پر ہیں اور یہی لوگ اپنی مراد کو پہنچنے والے ہیں تو ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم بھی انھی کے راستے پر چلیں، سورۂ فاتحہ میں بھی ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ:

{اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ، صِرَاطَ الَّذِيۡنَ أَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ}(الفاتحۃ:۷-۶)۔

(ہمیں سیدھا راستہ لے چل، ان لوگوں کا راستہ جن پر تونے انعام کیا۔)

گویا اس تعلیم سے اس آیت کا ایک طرح کا ارتباط بھی ہے، یعنی جن لوگوں نے یہ صفات اختیار کیں وہ اللہ کے منعم علیہم بندے ہیں اور ہم اسی کی مستقل دعا کررہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت عطا فرما، مفسرین نے لکھا بھی ہے کہ صراط مستقیم سے مراد اسلام ہے، پھر یہ کہا گیا کہ تیرے وہ خاص بندے جن پر تیرا انعام ہوا اور انھوں نے اس راستے پر چل کر دکھایا، ہمیں وہ راستہ عطا فرما، اب یہاں گویا ان صفات پر چلنے والوں کا بیان ہوگیا کہ ان منعم علیہم بندوں کی یہ صفات ہیں اور یہ تعلیم دے دی گئی کہ جو لوگ یہ صفات رکھتے ہیں، اگر انھی صفات پر چلنے کی کوشش کروگے تو اللہ تبارک وتعالیٰ تمہیں بھی کامیابی وہدایت عطا کرے گا جس کی تم دعا کرتے ہو اور اس طرح تم اپنی منزل کو پہنچ جاؤگے اور اپنی مراد کو حاصل کرنے والے شمار ہوگے۔

☆☆☆

نوجوانوں کی تہذیبی واخلاقی تربیت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

نوجوانوں کی نسل اپنی نفسیاتی خصوصیات میں بڑی نسل سے خاصی مختلف ہوتی ہے۔ اس کے تقاضے اور اس کی دشواریاں علاحدہ نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اس کو ایک طرف زندگی کے تجربات حاصل کرنے ہوتے ہیں اور دوسری طرف اس کے جذبات کے تقاضے الگ ہوتے ہیں۔ وہ معاشرے کے اندر تنہا بھی نہیں ہوتی ہے، بلکہ مختلف عمر کے انسانی نسلوں کے درمیان ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سے اس کے مسائل میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے اور اس کے تقاضوں کا خیال رکھنا اور ان تقاضوں کے مطابق اس کی ترقی اور اس کی تہذیبی اور اخلاقی تربیت اور تشکیل مزید توجہ کی محتاج ہوتی ہے۔ ☆☆

تعلیم الحدیث

توحید، توکل اور تدبیر

مولانا عبد الرشید راجستھانی ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيفِ، وَفِي كُلٍّ خَيْرٌ، احْرِصْ عَلَى مَا يَنْفَعُكَ، وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، وَلَا تَعْجِزْ، وَإِنْ أَصَابَكَ شَيْءٌ فَلَا تَقُلْ: لَوْ أَنِّي فَعَلْتُ كَذَا وَكَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللّٰهُ، وَمَا شَاءَ فَعَلَ، فَإِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ۔ (مسلم: ۲۶۶۴)

ترجمہ: -حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: طاقت ور مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک کمزور مومن سے زیادہ محبوب اور بہتر ہے، اگرچہ ہر ایک میں خیر ہے۔ جو چیز تمہارے لیے نفع بخش ہو، اس کے حصول کے لیے پوری کوشش کرو، اللہ سے مدد مانگو اور عاجز وسست نہ بنو۔ پھر اگر کوئی ناگوار چیز پیش آجائے تو یہ نہ کہو کہ اگر میں ایسا کرتا تو یوں ہوجاتا، بلکہ یہ کہو: قَدَّرَ اللّٰهُ، وَمَا شَاءَ فَعَلَ، اللہ نے یہی مقدر فرمایا تھا اور جو اس نے چاہا وہی ہوا، کیونکہ ’’اگر‘‘ شیطان کے عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

شرح: -یہ حدیث توحید، توکل اور اختیارِ اسباب کے درمیان ایک جامع اور متوازن اصول بیان کرتی ہے۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اسباب ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں، گویا کامیابی اور ناکامی کا مدار صرف انسانی تدبیر، وسائل اور منصوبہ بندی پر ہے، جبکہ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اسباب کو چھوڑ دینے کو توحید، تفویض اور توکل کا نام دے دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے چند مختصر مگر جامع جملوں میں ان دونوں انتہاؤں کی اصلاح فرمادی۔

فرمایا: ’’احْرِصْ عَلَى مَا يَنْفَعُكَ‘‘، یعنی جو چیز دین ودنیا میں واقعی نفع بخش ہو، اس کے حصول کے لیے پوری محنت، منصوبہ بندی اور جدوجہد کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسباب اختیار کرنا، علم حاصل کرنا، تجارت کرنا، علاج کرانا، کھیتی باڑی کرنا، صنعت وحرفت اپنانا وغیرہ ایمان کے خلاف نہیں بلکہ شریعت کا مطلوب ہے۔

اس کے فوراً بعد فرمایا: وَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، یعنی اسباب ضرور اختیار کرو، لیکن اعتماد صرف اللہ تعالیٰ پر رکھو۔ یہ یقین رہے کہ اسباب بذاتِ خود کچھ نہیں کر سکتے، مؤثرِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اسباب محض ذریعہ ہیں اور نتیجہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدا ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی پوری سیرت اسی حقیقت کی عملی تفسیر ہے۔ ہجرت کے موقع پر آپ ﷺ نے رات کے وقت روانگی اختیار فرمائی، مدینہ کا معروف راستہ چھوڑا، غارِ ثور میں قیام فرمایا، عبداللہ بن اُریقط کو بطورِ رہبر مقرر فرمایا، زادِ راہ اور اطلاعات کی فراہمی کا مکمل انتظام کیا، مگر دل کا اعتماد صرف اللہ تعالیٰ پر تھا۔ اسی لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ﴿لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾۔

اسی طرح غزوات میں آپ ﷺ نے زرہ پہنی، صف بندی فرمائی، نگرانی اور اطلاعات کا انتظام کیا، مشورے کیے اور مناسب مقامات کا انتخاب فرمایا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی نصرت پر کامل یقین رکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسباب اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں بلکہ سنت نبوی ﷺ ہے۔

صحابۂ کرامؓ نے بھی یہی تعلیم حاصل کی۔ حضرت عمر بن خطابؓ جب شام کی طرف جارہے تھے اور راستے میں طاعون کی خبر ملی تو آپ واپس لوٹ آئے۔ جب کہا گیا: کیا آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ تو فرمایا: نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ إِلَى قَدَرِ اللّٰهِ۔ ہم اللہ کی ایک تقدیر سے اللہ ہی کی دوسری تقدیر کی طرف جارہے ہیں۔

اس ایک جملے میں توکل، تقدیر پر ایمان اور اختیارِ اسباب تینوں جمع ہوگئے۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وَلَا تَعْجِزْ، یعنی سستی، بے عملی، ہمت ہار دینا، کوشش چھوڑ دینا اور تدبیر کرنے میں کوتاہی کرنا مومن کی شان نہیں۔ توکل کا مطلب ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا نہیں، بلکہ پوری قوت سے جائز اسباب اختیار کرنا اور نتیجہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردینا ہے۔

آخر میں آپ ﷺ نے تقدیر پر ایمان کا وہ عظیم ادب سکھایا جو انسان کو حسرت، مایوسی اور ذہنی اضطراب سے محفوظ رکھتا ہے۔ بندہ پوری کوشش کے باوجود مطلوب نتیجہ حاصل نہ کر سکے تو ماضی کے افسوس میں ڈوب کر ’’اگر ایسا کرتا تو ایسا ہوجاتا‘‘ نہ کہے، بلکہ یہ کہے: قَدَّرَ اللّٰهُ، وَمَا شَاءَ فَعَلَ، کیونکہ ’’لو‘‘ شیطان کے وسوسوں، مایوسی اور بے فائدہ حسرت کے دروازے کھول دیتا ہے، جبکہ مومن اللہ کے فیصلے پر راضی رہتے ہوئے غلطیوں سے سبق لیتا ہے، اپنے عزم کو تازہ کرتا ہے اور آئندہ مزید بہتر اسباب اختیار کرتا ہے۔

یہی توحید کا حقیقی تقاضا ہے کہ انسان کے ہاتھ اسباب کے ساتھ ہوں، اس کی محنت مکمل ہو، اس کی تدبیر بہترین ہو، لیکن اس کا دل صرف ربُّ الاسباب سے وابستہ ہو۔ یہی کامل توکل، یہی سنتِ نبوی ﷺ اور یہی وہ راستہ ہے جو دنیا وآخرت دونوں کی کامیابی کا ضامن ہے۔

☆☆☆

تعلیم الفقہ

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

سوال: اگر چند لوگ مل کر پیسے جمع کریں اور ایک شخص کو ذمہ داری دیں کہ وہ محنت کرے اور جو منافع ہوں گے سب برابر برابر تقسیم کرلیں گے، تو کیا اسلام میں اس طرح کا کاروبار کرنا جائز ہے؟

جواب: اگر ایک یا اس سے زیادہ حضرات سرمایہ لگائیں اور دوسرا شخص اس پر محنت کرے اور پہلے سے یہ بات طے ہوجائے کہ جو بھی نفع حاصل ہوگا وہ برابر سرابر یا مقررہ شرح کے مطابق تقسیم ہوجائے گا یہ صورت جائز ہے۔ اس کو شریعت اسلامی میں مضاربت کہتے ہیں۔

المضاربه في الشرع عبارة عن عقد الشركه بمال من أحد الجانبين و العمل من الجانب الآخر وهي مشروعه للحاجة اليها [ہدایہ مع الفتح، ص/ ۴۱۴]۔

سوال: دو شخص نے مضاربت کے طور پر کام شروع کیا، ایک کے پیسے لگے اور دوسرے کی محنت آپس میں یہ طے ہوا کہ نفع ہونے کی صورت میں دونوں آدھا آدھا تقسیم کرلیں گے، اسی طرح نقصان میں بھی دونوں برابر برابر حصہ لیں گے، سوال یہ ہے کہ کیا محنت کرنے والے کو اصل رقم کی بھرپائی کرنی ہوگی؟

جواب: مضاربت میں اصول یہ ہے کہ اگر نقصان ہوتو پہلے نفع میں سے اس کی تلافی کی جائے گی اور اگر نفع ہوا ہی نہیں یا نقصان کے مقابلے نفع کم ہوا تو نفع سے زیادہ ہونے والے نقصان کی ذمہ داری سرمایہ کار پر ہوگی یعنی جن کی پونجی ہے ان پر ہوگی، محنت کرنے والے پر نہیں ہوگی۔ (حوالہ سابق)

سوال: ایک شخص کی آمدنی کا ذریعہ زمین کی خرید و فروخت ہے؛ لیکن سرمایہ نہ رہنے کی وجہ سے ایک غیر مسلم کے ساتھ تجارت کرنا چاہتا ہے اور وہ اس شرط پر راضی ہے کہ پونجی میری ہوگی اور محنت آپ کی رہے گی اور نفع میں دونوں آدھے ادھے کے شریک ہوں گے جس کو شرع اسلامی کے نقطۂ نظر سے مضاربہ کہتے ہیں، غیر مسلم کے ساتھ مل کر اس طرح کاروبار کرنا شرعاً درست ہے؟

جواب: اسلامی نقطۂ نظر سے مضاربہ کا معاملہ مسلمان کے ساتھ بھی کیا جاسکتا ہے اور غیر مسلم کے ساتھ بھی، البتہ یہ ضروری ہے کہ نفع کا تناسب طے کیا جائے، نفع کی قطعی مقدار متعین نہ کی جائے۔ [ہدایہ مع فتح القدیر: ۴/ ۴۱۴]

سوال: ایک مسلمان نے اپنے ایک غیر مسلم ساتھی کے ساتھ پارٹنر شپ پر مضاربہ کا کام شروع کیا، مسلم نے سرمایہ فراہم کیا اور غیر مسلم محنت کررہا ہے، مسلمان نے یہ تاکید کررکھی ہے کہ کاروبار جائز طریقے سے ہو اور خرید فروخت میں وہی چیزیں لی اور دی جائیں جو اسلامی طور پر حلال اور جائز ہوں، مثلاً وہ ہوٹل چلاتے ہیں تو مسلم پارٹنر یہ شرط رکھے ہوئے ہیں کہ اس میں حلال چیز ہی کھلائیں، غیر مسلم ساتھی یہ یقین دلاتے ہیں کہ میں حلال کھانا ہی گاہکوں کو کھلاتا ہوں، کیا غیر مسلم دوست کے اس اعتماد پر کاروبار کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

جواب: غیر مسلم دوست کو پارٹنر بنا کر بطور مضاربہ کاروبار کیا جاسکتا ہے، اسی طرح جو شرائط رکھی گئی ہیں، ان کے مطابق اگر وہ عمل کرتے ہیں اور اعتماد دلاتے ہیں تو اس اعتماد پر کاروبار کرنا درست ہے، کیونکہ شرع اسلامی میں ورکنگ پارٹنر مسلم سرمایہ کار کا تجارت میں وکیل ہوتا ہے اور وکالت کا شمار معاملات میں ہے، اس لیے غیر مسلم ساتھی کی اطلاع پر بھروسہ کرکے کاروبار کرنے کی شرعاً اجازت ہے۔ [البحر الرائق: ۸/ ۱۸۷]

سوال: آج کل بینک یا فائنانس کمپنیاں کار اور موٹر سائیکل خرید کر دیتی ہیں، اور قسطوں پر ان کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، اس سے لوگوں کو بہت سہولت ہوجاتی ہے، کیا کوئی مسلمان بذریعہ بینک یا بطور فائنانس گاڑی خرید سکتا ہے؟

جواب: بینک یا فائنانس کمپنی کے ذریعے سے گاڑی اگر بربنائے ضرورت خریدی جائے نقد لینے کی صورت نہ ہو اور مجبوراً فائنانس کے طور پر لینا پڑے تو شرعاً ضرورت کی وجہ سے اس کی گنجائش ہے، لیکن بینک سے اگر اس طرح قرض فراہم کیا جائے یا گاڑی فروخت کی جائے کہ اتنی قیمت اصل ہوگی اور اتنی قیمت انٹرسٹ کی تو یہ صورت جائز نہیں ہے البتہ آج کل بعض کمپنیوں نے صفر سود کی اسکیمیں بھی نکالی ہیں یعنی گاڑی کی ایک ہی قیمت متعین ہوتی ہے جو نقد کی صورت میں زیادہ ہوتی ہے اور کمپنیاں شروع میں ہی اپنے نفع کی رقم وصول کرلیتی ہیں اور اس شوروم کی اصل قیمت کو قسطوں پر تقسیم کردیتی ہیں، بعد میں کوئی قسط ادا نہیں ہوئی تو رقم بڑھائی نہیں جاتی بلکہ گاڑی ضبط کرلی جاتی ہے اور اسے فروخت کرکے کمپنی اپنی باقی ماندہ قیمت وصول کرلیتی ہے اور جو پیسے بچ جاتے ہیں اسے واپس کردیا جاتا ہے، یہ صورت شرعاً جائز ہے اور سود کے دائرے میں نہیں آتی ہے۔

☆☆☆

قندمکرر

اسناد اور درس گاہوں کی اصطلاحیں

حضرت مولانا عبداللہ عباس ندویؒ (سابق معتمد تعلیم ندوۃ العلماء)

مدرسہ ایک قدیم اصطلاح تھی، دانش کدہ اور تعلیم گاہوں کے لیے، دنیا کی قدیم درسگاہ اسلامی علوم کے لیے جامعہ زیتونیہ ہے جس کا قدیم نام مدرسہ ہی تھا، اسی طرح الازہر شریف ایک مسجد کا نام ہے اور مسجد کو عربی میں جامع کہتے ہیں، اٹھارہویں صدی کے اخیر میں اس مسجد کے مدرسہ کو یونیورسٹی کی شکل دی گئی، اس وقت سے جامع جامعہ ہو گیا، مدرسہ نظامیہ بغداد، مدرسہ متوکلیہ دمشق، مدرسہ ظاہریہ حلب، مدرسہ ناصریہ مراکش، مدرسۂ نظامیہ فرنگی محل یہ سب مدرسے تھے، جہاں سے علم وفن کے قابل اعتبار اور قابل حجت علماء نکلے، ہندوستان میں بھی سرسید کے ادارہ کا نام جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے، مدرسۃ العلوم ہی تجویز فرمایا تھا، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دیوبند میں جس درسگاہ کی بنیاد ڈالی وہ بھی مدرسہ کے نام سے موسوم تھی، غرض مدرسہ جس کی اصطلاح اب ختم ہوتی جارہی ہے، اوراس کی جگہ جامعہ کا لفظ استعمال کیا جانے لگا ہے، کوئی معمولی چیز نہ تھی، اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ جامعہ جو ہندوستان کے عربی اور اسلامی مدرسوں کا عمومی لقب بن گیا ہے، اس میں اوران عصری دانش گاہوں میں جن کو یونیورسٹی کہا جاتا ہے اس کا ترجمہ بھی جامعہ کیا جاتا ہے، جامعہ لکھنؤ اور جامعہ میں کیا فرق ہے؟ یہ سوال میرے لیے اس وقت بھی الجھن کا باعث ہوتا تھا جب عرب ممالک میں اسناد کے معادلہ کی بات ہوتی اور لوگوں کو جامعہ علی گڑھ اور کسی عربی مدرسہ کے درمیان فرق کر کے بتانا ہوتا، عام طور پر یہ سمجھا جاتا کہ حکومت وقت کی سرکردگی میں چلنے والے ادارے یونیورسٹی یا جامعہ عصریہ یا حکومیہ کہہ کر ممتاز کیے جاتے اور مدارس اسلامیہ جنھوں نے اپنے آپ کو مدرسہ کے بجائے جامعہ کہلانا پسند کیا ہے، ان کو شعبیہ اہلیہ کہہ کر جان چھڑائی جاتی، زبان میں ہمیشہ وسعت ہوتی رہتی ہے، اصطلاحات بدلتی رہتی ہیں، اس لیے اگر اہل مدارس اپنی درسگاہوں کو جامعہ کہیں تو اس میں کوئی لسانی، شرعی یا قانونی قباحت نہیں، اصطلاحات میں توسع ضرب المثل ہے، لیکن ان حضرات کے لیے جن کے ذہن میں ان اسماء اور مسمیات کا فرق نہیں ہے ان کے لیے تعریفی اصطلاحات کے طور پر حسب ذیل تشریحات ان شاء اللہ مفید ہوں گی:

(۱) یونیورسٹی یا اس کا ترجمہ جامعہ اس ادارہ کو کہتے ہیں جو مختلف کالجوں کا جامع ہو اور ہر کالج اپنی جگہ پر ایک اکائی ہو جس کا انتظامیہ تعطیلات کا نظم، تعلیم کے اوقات، کسی کے پابند نہ ہوں، طلبہ کا یونیفارم بھی مختلف ہوتا ہے، اور یہ سب اپنی ڈگریاں جس ادارے سے حاصل کرتے ہیں اس کو یونیورسٹی کہتے ہیں، اگر کسی خاص فن کی تعلیم کا ادارہ ہے تو اس کو انسٹی ٹیوٹ (Institute) کہا جاتا ہے جس کا ترجمہ بلا سبب معہد کیا جارہا ہے۔

(۲) اسکول ہندوستان میں ثانوی مدرسے یا اس سے نیچے پرائمری درجات کی تعلیم گاہ کو کہتے ہیں، اس کا ربط جامعہ سے نہیں ہوتا ہے، ان اسکولوں سے نکلنے والے طلبہ اعلیٰ تعلیم کے لیے جب کسی کالج کا رخ کرتے ہیں تو ان کا وہ کالج کسی یونیورسٹی سے مربوط ہوتا ہے، یورپ میں اسکول بڑی اہمیت رکھتا ہے، وہ انسٹی ٹیوٹ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، اور بسا اوقات اس کی تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ اگر فن یا ایک صنعت کے لیے انسٹی ٹیوٹ ہے تو اسکول ایک شعبہ سے متعلق مضامین پڑھانے اور اس پر ریسرچ کرنے کے انتظام کرتا ہے، جیسے لندن یونیورسٹی میں (School of Oriental and African Studies) ہے، جس میں مشرقی ممالک کی زبانیں، مذاہب کلچر وغیرہ کی تعلیم بھی ہوتی ہے اور ان پر ریسرچ کر کے اسی اسکول کے راستہ سے لوگ ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرتے ہیں، جس پر مہر بہر حال ''جامعہ لندن'' ہی کی ہوتی ہے، اسی طرح ہارورڈ یونیورسٹی (Harward University)، کیلیفارنیا یونیورسٹی (California University) میں ترتیب یہ ہے کہ انسٹی ٹیوٹ سے فارغ ہونے والے ڈپلوما پاتے ہیں اور اسکول سے نکلنے والے اعلیٰ ڈگریاں اپنی متعلقہ یونیورسٹی سے پاتے ہیں۔ رہائشی یونیورسٹیاں، یو کے کالج سب ایک ہی کیمپس مین ہیں، وہاں کالجوں کے بجائے فیکلٹی (Faculty) کی اصطلاح ہے، اگر یہی فیکلٹی کسی دوسرے شہر میں ہو یا یونیورسٹی کے انتظامیہ سے براہ راست متعلق نہ ہو تو وہ کالج کہے جائیں گے، تعلیم کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ بچہ پانچ سال کی عمر میں مدرسہ جانا شروع کرتا ہے، اس سے کچھ کم عمر کے بچے صنعتی ملکوں میں کنگ گارڈن،

نرسری اسکول وغیرہ میں رکھے جاتے ہیں، ابتدائی کے عموماً چھ سال ہوتے ہیں جس کے مختلف نام ہیں، گیارہ سال کی عمر کی بعد لڑکا مزید چھ سال ثانوی تعلیم حاصل کرتا ہے، اس کو کالج میں داخل ہونے کے لائق بن جانے کی سرٹیفکیٹ دی جاتی ہے، ہندوستان میں پہلے ثانوی اسکول کی اختتامی سرٹیفکیٹ کو انٹرنس سرٹیفکیٹ کہا جاتا تھا، یعنی اب وہ کالج میں داخل ہوگیا، کالج میں مضامین زیادہ سے زیادہ چھ اور کم سے کم چار ہوتے ہیں جس میں مقامی (ورناکولر) اور سرکاری زبان بھی داخل ہے، اسی چار سالہ مرحلہ کو پاس کرنے والے فارغ التحصیل سمجھے جاتے ہیں، ان کو جو ڈگری دی جاتی ہے اس کو بیچلر کہا جاتا ہے، اس کے لفظی معنی صرف کنوارا ہونے کے نہیں ہے، بلکہ پختہ کار مرد بالغ العمر جوان کے بھی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک تعلیم یافتہ شہری ہونے کے لحاظ سے ہر قسم کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہے، فرنچ میں اس کو ''بکالیورس'' کہتے ہیں، پھر جب سے ادبیات اور سائنس کی تعلیم میں وسعت ہوئی تو ادبیات کے فارغ کو لیسانس (یا انگریزی میں بی اے کہنے لگے) اور سائنس کے لائن سے نکلنے والوں کو بکالیورس اور انگریزی میں بی ایس سی کہا جانے لگا۔

اس مرحلہ کے بعد کسی ایک خاص موضوع پر کوئی شخص ماہرانہ دسترس حاصل کرنا چاہے تو اگر وہ اپنی صلاحیت کے اظہار مقالہ کے ذریعہ کرے تو ماسٹر آف فلاسفی (ایم فل) کی ڈگری پاتا ہے اور اگر زبان اور تحریری امتحان دے کر اپنا حق تسلیم کرائے تو اس کو ماسٹر آف آرٹ (M.A.) یا ماسٹر آف سائنس (MSc) کا درجہ ملے گا، ہندوستان میں ایم اے کے بعد ایم فل کرایا جاتا ہے، جیسے یورپ کی یونیورسٹیز میں ایم اے کے بعد اس فن میں ڈپلوما کراتے ہیں، ہر جگہ کا اپنا علیحدہ پروگرام ہے، کہیں بی اے آنرس کے بعد ہی اجازت دی جاتی ہے، اس مرحلہ کے ساتھ یا اس کے بعد اور کبھی کبھی اس سے پہلے بھی کسی ایک فن کے کسی خاص نقطہ پر کوئی ایسی تحقیق کرے جس کو یہ کہا جائے کہ اس نے اس فن میں اضافہ کیا تو اس کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے فن کے کسی خاص گوشہ کی فلاسفی میں کسی اضافہ کے باعث ہوا ہے، Ph.D کا مطلب ہے:

"To produce something new, certain academic field".

اہل ایران ڈاکٹر کا ترجمہ ''علیم'' کرتے ہیں، اصطلاح کی بات اور ہے، ورنہ یہ درحقیقت یہ کوئی ترجمہ نہیں ہوا، عربوں نے اس کو کوئی بدل تلاش نہیں کیا اور نہ مشرقی زبانوں میں کوئی مناسب لفظ سنا گیا۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ ہمارے مدارس اب مدرسہ کے لفظ کو کثرت سے ترک کر رہے ہیں اور اپنی درسگاہوں کو جامعہ کہلانا پسند کرتے ہیں۔ اصطلاح کی حد تک ان کا حق ہے کہ جو لفظ بھی چاہیں اور جو نام بھی چاہیں رکھ لیں، لیکن فنی لحاظ سے یہ سمجھنا چاہیے کہ مدرسے جہاں صرف دین اسلام کی تعلیم ہوتی ہے، اور اس سے متعلقہ فنون پڑھائے جاتے ہیں، وہ ایک انسٹی ٹیوٹ کہے جاسکتے ہیں۔ اگر ان کے اندر ادب، قرآن، حدیث، فقہ، منطق کی تعلیم کا انتظام ہے، جب بھی یہ سب اپنی جگہ پر اکائیاں نہیں ہیں بلکہ ایک دھاگہ میں پروئی ہوئی موتیاں ہیں اور ایک انتظامیہ کے ماتحت ان تمام علوم کی تعلیم دی جاتی ہے، صحیح تعریف کے لحاظ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی جامعہ نہیں ہے اگرچہ اس کی پچاس شاخیں ہیں، لیکن جب تک پچاس شاخوں میں مختلف علوم وفنون پڑھانے کا انتظام نہ ہو اور دوسری جگہ پڑھنے والے سند یہاں سے پاتے ہوں اس وقت تک اس کو جامعہ کہنا صحیح نہیں ہے، بلکہ ایک درجہ غلط العوام کی پیروی بلکہ ایک حد تک احساس کہتری کی دلیل بھی ہے، ندوہ کے لیے یہ بات قابل فخر ہے کہ ہندوستان میں دارالعلوم کا لفظ اسی نے ۱۹۱۱ء میں متعارف کرایا اور یہ لفظ بھی ایک وسیع انسٹی ٹیوٹ یا زیادہ سے زیادہ کالج کا ہم معنی ہے، غالباً الازہر اور جامعہ قاہرہ کے درمیان جو دار العلوم ہے اور جہاں قرآن اور زبان کی تعلیم پر زیادہ اعتناء برتا جاتا تھا، وہ یہاں کے بزرگوں کے پیش نظر ہوگا، لیکن بلکہ عجیب بات یہ دیکھنے میں آتی ہے کہ لوگ مدرسہ کو چھوٹا اور حقیر سمجھ کر نا قابل التفات سمجھتے ہیں اور اپنی درسگاہ کو مدرسہ کہنا شاید ازالہ حیثیت عرفی سمجھتے ہوں لیکن یہ جامعہ کے ساتھ دارالعلوم کا مرکب استعمال کرنے لگے ہیں، مثلاً کوئی کہے انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی، یا اسکول یونیورسٹی، ظاہر ہے کہ یا تو ایک ادارہ اسکول ہے یا یونیورسٹی، بہرحال اس طرح کے غلط العوام مفاہیم کی تصحیح سے مقصود کسی کی توہین نہیں ہے، اور نہ ناواقفیت کا الزام لگانا ہے، البتہ ان دوستوں سے جو کوئی دینی تعلیم کے لیے ادارہ قائم کرنا چاہتے ہیں ان سے ضرور کہوں گا کہ واقفیت کے بعد سمجھ بوجھ کر کوئی نام پسند کریں، کوئی اپنے کو جامعہ کہے، کوئی دارالعلوم اور کوئی دانش کدہ ع

تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے میخانے کا نام

☆☆☆

امت وسط

اعتدال کا راستہ

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء)

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُو الْأَلْبَابِ﴾۔

حضراتِ علماءِ کرام اور بزرگانِ دین!

یہ ہمارے لیے سعادت اور خوشی کی بات ہے کہ آپ حضرات کے درمیان حاضری کا موقع ملا۔ ساتھ ہی ایک احساسِ شرمندگی بھی ہے کہ بعض حضرات کو انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑی۔

اس وقت دنیا اور خصوصاً ہمارے ملک کے جو حالات ہیں، وہ ہم سب کے لیے اور بالخصوص طبقۂ علماء کے لیے لمحۂ فکریہ ہیں۔ اس لیے کہ امت کی فکری، دینی اور اخلاقی رہنمائی کی ذمہ داری علماء کے سپرد ہے۔ علماء کا خیر، امت کا خیر ہے، اور اگر خدانخواستہ علماء کے فکر و عمل میں انحراف پیدا ہو جائے تو اس کے اثرات پوری امت تک پہنچتے ہیں۔

علماء امت کی کسوٹی اور قطب نما

علماء کی حیثیت اس قطب نما (Compass) کی مانند ہے جو سمندر میں چلنے والے جہاز کو راستہ دکھاتی ہے۔ اگر قطب نما کی سوئی معمولی سی بھی اپنے اصل رخ سے ہٹ جائے تو ابتداء میں فرق محسوس نہیں ہوتا، لیکن سفر جوں جوں آگے بڑھتا ہے، جہاز اپنی اصل منزل سے میلوں دور جا پہنچتا ہے۔ علماء کی ذمہ داری بھی اسی نوعیت کی ہے۔ بسا اوقات معمولی سمجھی جانے والی فکری لغزشیں مستقبل میں بڑے انحرافات کا سبب بن جاتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ علماء ہر قدم پر اپنے رخ، فکر اور دعوت کا محاسبہ کرتے رہیں۔

امت کی کامیابی کی دو بنیادی بنیادیں

اگر غور کیا جائے تو امت کی فلاح و بقا دو بنیادی اصولوں پر موقوف ہے:

۱۔اصول و عقائد میں کامل استقامت

اللہ تعالیٰ نے امت کو جو نظام وحدت عطا فرمایا ہے، اس کی بنیاد سلفِ صالحین کے فہم پر قائم ہے۔ سلف سے سب سے پہلے حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم مراد ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے دین کا ایسا صحیح فہم عطا فرمایا جو قیامت تک امت کے لیے معیار رہے گا۔ سورۂ فاتحہ میں ہمیں روزانہ یہ دعا سکھائی گئی: ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ، صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾۔

اور قرآن مجید نے واضح کیا:

﴿مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ وَحَسُنَ أُولَئِكَ رَفِيقًا﴾۔

یہی وہ جماعت ہے جس کی رفاقت کامیابی کی ضمانت ہے۔

۲۔فروع اور وسائل میں جائز توسع

دوسری بنیاد یہ ہے کہ جہاں شریعت نے گنجائش رکھی ہے وہاں وسعتِ نظر اختیار کی جائے۔ یہ وسعت دین کے اصولوں میں نہیں بلکہ فروع، جزئیات اور وسائل میں ہے۔ جب وسائل کو مقاصد کا درجہ دے دیا جاتا ہے تو اختلافات جنم لیتے ہیں، لیکن جب اصل مقصد دینِ اسلام رہتا ہے تو اتحاد پیدا ہوتا ہے۔

مقاصد اور وسائل کا فرق

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ مدارس، تنظیمیں، تحریکیں اور دعوتی ادارے سب دین کے خادم ہیں، خود دین نہیں۔ مدارس، تبلیغی نظام، جماعتیں اور تنظیمیں دراصل وسائل ہیں، مقاصد نہیں۔ اصل مقصد اللہ کا دین ہے۔ جب کوئی ادارہ یا طریقۂ کار خود مقصد بن جائے تو اختلاف اور انتشار پیدا ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے نظام کو عین دین سمجھنے لگتا ہے، حالانکہ حقیقت میں دین ان تمام وسائل سے بلند اور وسیع ہے۔

توسع اور انحراف کے درمیان باریک فرق

یہاں ایک بڑی نزاکت ہے۔ کبھی لوگ توسع کے نام پر صرف وسائل اور فروع تک محدود نہیں رہتے بلکہ عقائد اور اصولوں میں بھی نرمی پیدا کرنے لگتے ہیں۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے۔ عقائد، عقائد ہیں۔ خواہ بنیادی عقائد ہوں یا ان سے متفرع اصول، ان میں کمی بیشی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر اصولوں اور عقائد میں انحراف پیدا ہو جائے تو پھر امت اپنی اصل بنیاد سے محروم ہو جاتی ہے۔

ندوۃ العلماء کا امتیاز

ندوۃ العلماء کی بنیادی دعوت ہمیشہ اعتدال اور توازن کی دعوت رہی ہے۔ لیکن بعض اوقات ندوہ کے بعض فارغین یا وابستگان اس اعتدال کے حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں اور وہاں تک پہنچ جاتے ہیں جہاں شریعت نے وسعت کی اجازت نہیں دی۔

حقیقت یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کی نمائندہ شخصیات خصوصاً: (۱) علامہ سید سلیمان ندویؒ (۲) مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی پوری زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ اصولوں میں ذرہ برابر انحراف کے بغیر بھی وسعتِ نظر اختیار کی جاسکتی ہے۔

دین کو ماحول کے تابع نہیں بنایا جاسکتا

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ جہاں جائیں وہاں

کے ماحول اور تہذیب کے مطابق دین کو ڈھال لینا چاہیے۔ یہ تصور درست نہیں۔ اسلام کا مطالبہ یہ نہیں کہ دین کو لوگوں کے سانچے میں ڈھال دیا جائے بلکہ یہ ہے کہ لوگوں کو دین کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ دین کو بدل دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص شاہی تخت کو اپنی چھوٹی کوٹھری میں داخل کرنے کے لیے کاٹ کاٹ کر ایک معمولی چوکی بنا دے۔ بظاہر وہ خوش ہوگا کہ تخت میرے گھر آ گیا، لیکن حقیقت میں اس نے تخت کی عظمت ختم کر دی۔

"امریکن اسلام" کا خطرہ

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ جب امریکہ تشریف لے گئے تو بار بار یہ تنبیہ فرماتے تھے:

"کہیں نیا امریکن اسلام تیار نہ ہو جائے، اسلام کی حفاظت کیجیے۔"

اسلام کسی ملک یا تہذیب کے مطابق تبدیل ہونے والا دین نہیں۔ اسلام مکمل ہو چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾۔

لہٰذا نہ کوئی نیا اسلام پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی مخصوص خطہ کے مطابق دین کی بنیادوں میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق کا تاریخی اعلان

رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد بعض لوگوں نے زکوٰۃ سے انکار کیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "أَيُنْقَصُ الدِّينُ وَأَنَا حَيٌّ؟" کیا میرے زندہ ہوتے ہوئے دین میں کمی کی جا سکتی ہے؟

یہ اعلان دراصل اس حقیقت کا اظہار تھا کہ دین میں کسی کو ردوبدل کا اختیار حاصل نہیں۔

نجات کا معیار: صحابہ رضی اللہ عنہم کا راستہ

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ"

اور جب صحابہؓ نے نجات پانے والے گروہ کے بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي" یعنی نجات کا راستہ وہی ہے جس پر رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ تھے۔

جمود بھی نقصان دہ، بے لگام توسع بھی نقصان دہ

بعض علماء ہر چھوٹی بات میں غیر ضروری سختی اختیار کرتے ہیں۔ ٹوپی کی شکل، لباس کا انداز یا بعض عرفی مسائل کو دین کا اصل مسئلہ بنا لینا درست نہیں۔ اسی طرح دوسری انتہا یہ ہے کہ ہر چیز میں نرمی اور مصلحت کا نام لے کر اصولوں میں بھی لچک پیدا کر دی جائے۔ اسلام دونوں انتہاؤں سے بچنے کا نام ہے۔

مفتیانِ کرام کی احتیاط کی حکمت

حضرت مولانا عبدالرشید نعمانیؒ فرمایا کرتے تھے: "لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ علماء پہلے کسی چیز کو ناجائز کہتے ہیں پھر بعد میں جائز قرار دیتے ہیں۔"

حضرت فرماتے تھے: "اس میں دین کی حکمت ہے۔"

پہلے تحقیق، احتیاط اور غور و فکر کیا جاتا ہے، پھر اطمینان کے بعد رخصت دی جاتی ہے۔ اگر ابتدا ہی میں ہر دروازہ کھول دیا جائے تو دین کی حفاظت مشکل ہو جاتی ہے۔

عصر حاضر میں علماء کے کرنے کے پانچ کام

آج علماء کی ذمہ داریاں صرف درس و تدریس تک محدود نہیں رہیں۔

(۱) مکاتب، مدارس، اسلامی اسکول اور دینی حلقے مضبوط کیے جائیں۔

(۲) ہر علاقے میں خواتین اور بڑی بچیوں کے لیے تربیتی و مشاورتی مراکز قائم کیے جائیں۔

(۳) علماء خود نوجوانوں کے لیے درسِ قرآن کا اہتمام کریں اور قرآن کو سلف کی تفسیری روایت کے مطابق سمجھائیں۔

(۴) خطبات کو معاشرتی اور عملی مسائل سے جوڑا جائے تاکہ عوام کی اصلاح ہو۔

(۵) محلوں اور بستیوں میں چھوٹے بیت المال قائم کیے جائیں تاکہ غریب، محتاج اور قرض دار افراد کی مدد کی جا سکے۔

لوگوں کو اداروں سے نہیں، اللہ سے جوڑو

حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نہایت سبق آموز واقعہ ہے۔

آپ نے ایک شخص سے پوچھا: "گشت میں جانے کی نیت کیا ہوتی ہے؟" اس نے جواب دیا: "لوگ تبلیغی جماعت سے جڑ جائیں"۔

حضرت نے فرمایا: "اگر یہی نیت ہے تو اخلاص نہیں۔"

پھر فرمایا: "لوگوں کو جماعت سے نہیں، اللہ سے جوڑو۔ رسول اللہ ﷺ سے جوڑو۔ دین سے جوڑو"۔ یہی دعوت کا اصل مزاج ہے۔

وحدتِ امت کا حقیقی راستہ

ندوہ ہو، دیوبند ہو، تبلیغ ہو یا کوئی اور دینی ادارہ؛ سب دین کی خدمت کے ذرائع ہیں۔ اصل مقصد اللہ کا دین ہے۔ جب مقصد دین ہوگا تو وحدت پیدا ہوگی، اور جب ادارے مقصد بن جائیں گے تو اختلافات جنم لیں گے۔

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

نقوش سیرت

مزاحِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیتی پہلو

مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی (خیر آبادی)

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ومحبوب محمد عربی ﷺ کو انسانوں کو شرک وضلالت اور جہالت و دنائت کے دلدل سے نکال کر ان کو اس فطرتِ سلیمہ پر لانے کے لیے بھیجا تھا جس پر اللہ نے ان کی تخلیق فرمائی تھی: ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا﴾۔ اس لیے آپ کو ایک معلم کی حیثیت عطا فرمائی، جیسا کہ خود رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: "إنما بعثتُ معلماً"۔

(رواہ ابن ماجہ، ۲۲۹)

ایک استاذ ومربی کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ اپنے تلامذہ اور متعلقین کے اندر وہ تمام کمالات پیدا کرنے پر توجہ دے جو انسانی فطرتِ سلیمہ کا تقاضا ہے، ان کی ہر پہلو سے تربیت فرمائے تا کہ کوئی گوشۂ حیات تشنہ نہ رہ جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ استاذ تند مزاج، سخت دل اور بدخو نہ ہو، وہ شیریں گفتار، اعلیٰ کردار اور خندہ رو ہو، اس کے حسنِ اخلاق اور رحمدلی کی وجہ سے تلامذہ اس سے مانوس ہوں، محبت کرتے ہوں اور اپنے مشفق استاذ کی قربت سے نفع یاب ہونے میں خوف و تردد نہ ہو۔ لہٰذا رسولِ کائنات محمدِ عربی ﷺ کی ذات میں اللہ رب العزت نے جمال وکمال کے وہ تمام اوصافِ حمیدہ، جو ایک مربی ومحسن استاذ کے لیے ضروری ہیں، جمع فرما دیے تھے۔ آپ کے اخلاقِ حسنہ کے بارے میں فرمایا: ﴿وَإِنَّكَ لَعَلَى خُلُقٍ عَظِيمٍ﴾ اور آپ ﷺ کے رحم دل، نرم مزاج ہونے کے بارے میں فرمایا: ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾۔ (آل عمران:۱۵۹)

(اللہ کی رحمت کے باعث آپ صحابۂ کرام کے لیے نرم دل ہو گئے، اور اگر آپ تند مزاج، سخت دل ہوتے تو صحابۂ کرام آپ کے پاس سے چلے جاتے۔)

اور آپ ﷺ کی رحمدلی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ﴾۔ (التوبۃ:۱۲۸)

بے شک تمہارے درمیان تم ہی میں سے وہ رسولِ اکرم تشریف لائے جن کو تمہارا مشقت میں پڑنا بہت گراں گزرتا ہے، وہ تمہاری خیر خواہی کے حریص ہیں اور مؤمنین پر بہت ہی مہربان اور رحم کرنے والے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ٹوٹ کر محسنِ اعظم ﷺ سے محبت کرتے تھے، آپ کی توجہ وعنایت اور نظرِ کرم سب پر یکساں ہوتی تھی، ہر صحابیِ رسول یہ محسوس کرتا تھا کہ میں آپ ﷺ کا سب سے قریبی اور خاص ہوں۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی مجلس میں باادب ہوتے اور نبوت ورسالت کا یہ رعب تھا کہ اونچی آواز سے بول نہیں پاتے تھے، فرطِ ادب میں آواز نیچی رکھتے تھے۔ اس وصف کو قرآن نے سراہا ہے:

﴿الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِندَ رَسُولِ اللّٰهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ﴾ (الحجرات)۔

(جو جاں نثار صحابہ رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اپنی آوازیں پست رکھتے تھے، یہ وہی نفوسِ قدسیہ ہیں جن کے دلوں کے تقویٰ کو اللہ نے جانچ لیا ہے۔)

لیکن آنحضرت ﷺ ایک استاذ و مربی تھے، وہ ہر وقت سنجیدہ رہ کر اپنے فدا کاروں کو اپنے سے غیر مانوس نہیں کر سکتے تھے، اس لیے کبھی کبھی بے تکلفی کی فضا خود پیدا فرماتے تا کہ ان کے اصحاب کھل کر ان سے اپنی بات کہہ سکیں، کبھی خوش طبعی فرماتے ہوئے ان سے مزاح اور دل لگی فرماتے تھے، کیوں کہ ہر وقت سنجیدہ رہنا بھی انسانی فطرت کے منافی ہے۔ حضرت عبداللہ بن حارث فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے زیادہ خوش طبعی کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔ حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کبھی کبھی بے تکلفی کے ساتھ ہمارے درمیان گھل مل جاتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ ہم سے مذاق بھی فرما لیتے ہیں۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا: ہاں، کیوں نہیں، لیکن میں کبھی غلط بات مذاق میں نہیں کہتا۔ (شمائل ترمذی)

دل لگی کے کچھ واقعات

چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابی نے رسولِ اکرم ﷺ سے سواری کی درخواست کی تو آپ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہِ تفنن فرمایا: ٹھیک ہے، ہم تم کو اونٹ کا ایک بچہ دیں گے۔ وہ کہنے لگے: مجھے تو سواری کی حاجت ہے، میں اونٹ کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے فرمایا: بھائی! جو بھی اونٹ ہوگا، وہ کسی اونٹنی کا بچہ ہی تو ہوگا۔ آپ کی دل لگی سمجھ کر وہ صحابہ کرام بہت محظوظ ہوئے۔ (شمائل ترمذی)

حضرت زاہر بن حرام اشجعی رضی اللہ عنہ دیہات کے رہنے والے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ عشق کرتے تھے۔ کبھی کبھی ماہتابِ رسالت کا دیدار کرنے کی غرض سے مدینہ منورہ حاضر ہوتے اور رسولِ خدا کے لیے کچھ نہ کچھ ہدیہ، جیسے شہد یا گھی، ضرور لاتے تھے۔ آپ جب ان کو رخصت فرماتے تو آپ بھی ان کو ہدیہ عطا فرماتے تھے۔ آپ کو بھی حضرت زاہر بن حرام سے بڑی محبت تھی، ان کے خلوص و محبت کی قدر فرماتے ہوئے کہتے تھے: زاہر ہمارے دیہاتی دوست ہیں اور ہم ان کے شہری دوست ہیں۔

زاہر بن حرام اشجعی رضی اللہ عنہ معمولی نقش و نگار کے، بلکہ قدرے بدصورت آدمی تھے۔ ایک دفعہ مدینہ کے بازار میں کھڑے غلہ فروخت کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چپکے سے ان کے پیچھے پہنچے اور اپنے دونوں دستِ مبارک سے زاہر کی دونوں آنکھیں اس طرح بند کر لیں کہ وہ آپ کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ گھبرا کر کہنے لگے: کون ہے بھائی؟ مجھے چھوڑو، یہ کیا مذاق کر رہے ہو؟ اور لگے اپنے ہاتھوں سے رسولِ خدا کے ہاتھوں کو ٹٹولنے لگے۔ جب ان کو احساس ہوا کہ یہ کائنات کا سب سے مبارک اور پیارا دستِ مبارک ان کی آنکھوں کو موندے ہوئے ہے تو فرطِ مسرت و عقیدت میں اپنی پشت کو سینۂ مبارک سے ملانے لگے، گویا ذاتِ رسالت سے چمٹ رہے ہیں، الگ ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پیار سے پکار رہے ہیں کہ کون ہے جو اس غلام کو مجھ سے خریدے؟ زاہر کہتے ہیں: یا رسول اللہ! اگر آپ بدشکل کو فروخت کریں گے تو گھاٹے کا ہی سودا ہوگا، کون مجھ جیسے کو خریدے گا؟ میری کیا قیمت ہے بھلا؟ رسولِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ نہیں، نہیں، تم کھوٹے نہیں، بلکہ اللہ کے یہاں تم بہت بیش قیمت ہو۔ (شمائل ترمذی)

ایک دفعہ ایک بوڑھی صحابیہ دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کیا: یا رسول اللہ! دعا فرمائیں کہ اللہ مجھے جنت میں داخل فرمائے۔ آپ نے مزاح کے طور پر فرمایا: اے فلاں کی ماں! جنت میں کسی بوڑھی عورت کا داخلہ نہیں ہوگا۔ یہ سن کر وہ صحابیہ روتے ہوئے واپس لوٹیں تو آپ نے صحابۂ کرام سے فرمایا کہ اس صحابیہ کو بتا دو کہ تم کو اللہ تعالیٰ جوان، خوبرو دوشیزہ بنا کر جنت میں داخل کریں گے، بڑھاپے کی اس حالت کو بدل دیں گے، جیسا کہ ارشادِ باری ہے: ﴿إِنَّا أَنشَأْنَاهُنَّ إِنشَاءً ، فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا ، عُرُبًا أَتْرَابًا﴾ یعنی ہم ان کو نئے سرے سے پیدا کریں گے اور ان سب کو نوعمر کنواریاں بنا دیں گے۔ (شمائل ترمذی)

یہ تمام واقعات دراصل ان حضرات کے لیے ایک سبق اور نمونہ ہیں جو اساتذہ اور مربیین کی صف میں شامل ہیں کہ ایک عظیم المرتبت استاذ کس طرح اپنے شاگردوں سے محبت کرنے والوں کو اپنا گرویدہ بنا کر ان کی تربیت کرتا ہے۔

آج ہم میں سے متعدد افراد تعلیم و تربیت کی نازک ذمہ داری انجام دے رہے ہیں، ان کے سامنے نونہالانِ ملت کی دینی، علمی اور اخلاقی تعمیر و ترقی کا مسئلہ ہے، انہیں قوم و ملت اور پوری انسانیت کے لئے مفید ترین نسل بنانا ہے، اس کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور زندگی کے ہر گوشہ اور ہر موقع پر آپؐ کے عملی نمونوں سے بڑھ کر کوئی دوسرا نمونہ مؤثر نہیں ہو سکتا، ضرورت ہے کہ اس کو حرزِ جاں اور نصب العین بنایا جائے۔

☆☆☆

مولانا محمد زین العابدین مظاہری رشادی جوارِ رحمت میں

۱۰/جولائی ۲۶ کو ملک کی ایک معروف دینی و ملی شخصیت مولانا محمد زین العابدین مظاہری رشادی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
مولانا مرحوم اپنی ملی افکار و خدمات کے لیے جانے جاتے تھے، انھوں نے مختلف شعبوں میں قوم و ملت کی خدمت کی، خاص طور پر ۱۹۸۲ء میں انھوں نے بنگلور میں 'دارالعلوم شاہ ولی اللہ' کی بنیاد ڈالی، اور کئی دہائیوں کی محنت کے بعد اسے ایک قابل قدر اور بہترین نظم و نسق کی حامل دانش گاہ بنایا۔
اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں ادارہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے، ان کی حسنات کو قبول فرمائے، سیئات سے درگذر فرمائے اور متعلقین ولواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

☆☆

ارشاد و تذکیر

حسد دل کا ناسور
غیبت روح کا زوال

مولانا محمد شاہد ناصری حنفی (مدیر ماہنامہ مکہ میگزین، ممبئی)

کچھ بیماریاں جسم کو کمزور کرتی ہیں اور کچھ انسان کے باطن کو۔ جسمانی بیماریوں کا علاج دوا، پرہیز اور وقت سے ہوجاتا ہے، مگر دل کی بیماریاں اس وقت تک ختم نہیں ہوتیں جب تک انسان اپنے نفس کا محاسبہ نہ کرے۔ انہی مہلک باطنی بیماریوں میں دو ایسی بیماریاں ہیں جنہوں نے ہر دور میں محبتوں کو نفرت میں، اخوت کو عداوت میں اور خیر خواہی کو رقابت میں بدل دیا ہے۔ ایک حسد ہے، جو دل کا ناسور ہے، اور دوسری غیبت ہے، جو روح کا زوال ہے۔

حسد کی آگ پہلے اس شخص کے اندر بھڑکتی ہے جس کے دل میں وہ پیدا ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کی خوشیوں سے بے چین، ان کی کامیابی سے مضطرب اور ان کی عزت سے پریشان رہنے لگتا ہے۔ پھر یہی بے چینی آہستہ آہستہ زبان پر آتی ہے اور غیبت، طعن، کردار کشی اور الزام تراشی کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ زبان بول رہی ہے، حالانکہ حقیقت میں دل کی بیماری اپنی آواز سنا رہی ہوتی ہے۔

یہ ایک عجیب انسانی کمزوری ہے کہ ہم اکثر کسی کی کامیابی تو دیکھ لیتے ہیں، مگر اس کے پیچھے چھپی ہوئی قربانیاں نہیں دیکھتے۔ ہمیں کسی کے چہرے کی مسکراہٹ نظر آتی ہے، مگر وہ آنسو دکھائی نہیں دیتے جو اس نے رات کی تنہائیوں میں بہائے تھے۔ ہم بلند عمارت دیکھتے ہیں، اس کی بنیادوں میں رکھی گئی برسوں کی محنت، صبر اور دعا کو نہیں دیکھتے۔ اسی ادھورے مشاہدے سے حسد جنم لیتا ہے، جبکہ اہلِ بصیرت دوسروں کی کامیابی کو اللہ کے فضل کی نشانی سمجھتے ہیں، نہ کہ اپنی محرومی کی بات۔

قرآنِ کریم نے غیبت کی شناعت کو ایک ایسے انداز میں بیان کیا ہے کہ انسان کا ضمیر کانپ اٹھتا ہے: "کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟" یہ تشبیہ اس لیے دی گئی کہ انسان جان لے، جس عزت کو وہ اپنی زبان سے مجروح کر رہا ہے، وہ محض ایک گفتگو نہیں بلکہ ایک سنگین اخلاقی جرم ہے۔ اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ نے حسد سے ڈراتے ہوئے فرمایا کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ گویا حسد دوسروں سے پہلے انسان کی اپنی نیکیوں کا دشمن ہے۔

افسوس یہ ہے کہ آج ہم نے اپنے نفس کے مقدمے میں خود ہی وکیل، خود ہی گواہ اور خود ہی منصف بننے کی عادت ڈال لی ہے۔ جو بات ہمارے مزاج کے موافق ہو، اسے "حق گوئی" کا نام دے دیتے ہیں، اور جو ہمارے نفس کو سکون پہنچائے، اسے ''اصلاح'' سمجھ لیتے ہیں۔ حالانکہ شریعت نے جہاں ضرورت کے وقت کسی برائی کی نشاندہی کی اجازت دی ہے، وہاں اس کے لیے اخلاص، عدل، علم، تقویٰ اور حقیقی ضرورت جیسی سخت شرائط بھی مقرر کی ہیں۔ افسوس کہ آج ان شرائط کو نظر انداز کر کے ہر تلخ کلامی کو حق گوئی، ہر کردار کشی کو دیانت اور ہر غیبت کو خیر خواہی کا عنوان دے دیا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب دل میں حسد، رنجش یا انا موجود ہو تو انصاف کا ترازو سیدھا نہیں رہتا۔ انسان سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ دین کی خدمت کر رہا ہے، جبکہ بسا اوقات وہ اپنے زخمی نفس کی تسکین میں مشغول ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ والوں نے ہمیشہ دوسروں کے عیب تلاش کرنے سے پہلے اپنے نفس کا احتساب کیا۔ وہ جانتے تھے کہ نفس اگر عبادت کے لباس میں آجائے تو اس کا دھوکا اور بھی خطرناک ہوجاتا ہے۔

آج سوشل میڈیا نے اس آزمائش کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ ایک تبصرہ، ایک پوسٹ یا ایک آڈیو لمحوں میں ہزاروں لوگوں تک پہنچ جاتی ہے۔ افسوس کہ بہت سے لوگ یہ سمجھے بغیر کہ وہ کس قدر بڑی ذمہ داری اٹھا رہے ہیں، دوسروں کی عزت کو اپنی مجلسوں اور سوشل میڈیا کی زینت بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ ہر لفظ جو زبان سے نکلتا ہے یا قلم سے لکھا جاتا ہے، وہ صرف لوگوں تک نہیں پہنچتا بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی محفوظ ہوجاتا ہے۔ اس لیے ایک صاحبِ ایمان کو صرف یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ لوگ کیا پڑھیں گے، بلکہ یہ بھی سوچنا چاہیے کہ قیامت کے دن میرا نامۂ اعمال کیا گواہی دے گا۔

دانا انسان دوسروں کی کامیابی کو دیکھ کر اپنی محنت بڑھاتا ہے، جبکہ کم ظرف انسان دوسروں کی کامیابی کو دیکھ کر اپنی زبان کھول دیتا ہے۔ ایک شخص دعا کرتا ہے کہ: ''اے اللہ! مجھے بھی اپنے فضل سے نواز''، اور دوسرا اسی فضل کو چھین لینے کی خواہش میں اپنی آخرت کا سرمایہ کھو دیتا ہے۔ یہی دونوں راستوں کا فرق ہے؛ ایک راستہ انسان کو اللہ کے قریب لے جاتا ہے اور دوسرا اسے اپنے ہی نفس کا قیدی بنا دیتا ہے۔

ہر انسان کو یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ آخر ہم دوسروں کی کامیابی سے پریشان کیوں ہوتے ہیں؟ کیا واقعی ہمیں کسی کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے، یا ہمارے دل میں اپنے لیے وہ مقام نہ ملنے کی کسک ہوتی ہے جسے ہم دوسروں میں دیکھ رہے ہوتے ہیں؟ اگر انسان دیانت داری سے اپنے باطن میں جھانکے تو اسے معلوم ہوگا کہ بہت سی شکایتوں کی جڑ دوسروں کا کردار نہیں بلکہ اپنے نفس کی بے چینی ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے بار بار دلوں کے تزکیے کی دعوت دی ہے، کیونکہ جب دل پاک ہو جاتا ہے تو زبان بھی پاکیزہ ہوجاتی ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں کسی کی عزت کم کر دینے سے انسان خود معزز نہیں ہو جاتا۔ سورج پر مٹی اچھالنے سے سورج کی روشنی مدھم نہیں ہوتی، بلکہ مٹی اچھالنے والے کے اپنے ہاتھ ہی آلودہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح کسی صالح، محنتی یا باکردار انسان کے خلاف افواہیں پھیلانے سے اس کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو عزت عطا فرماتے ہیں تو لوگوں کی زبانیں اس عزت کو زیادہ دیر تک چھین نہیں سکتیں۔ قرآن کا اٹل اصول ہے:

﴿وَتُعِزُّ مَن تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَن تَشَاءُ﴾۔

(تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے۔)

تاریخ گواہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام سے لے کر اولیائے امت، مصلحین اور اہلِ حق تک شاید ہی کوئی ایسا گزرا ہو جسے طعن و تشنیع، الزام اور بہتان کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ مگر وقت نے ہمیشہ یہ ثابت کیا کہ الزام لگانے والوں کے نام مٹ گئے اور اخلاص کے ساتھ کام کرنے والوں کا ذکر باقی رہ گیا۔ اس لیے ایک صاحبِ ایمان کی توجہ اپنی شہرت کے دفاع سے زیادہ اپنے کردار کی اصلاح پر ہونی چاہیے، کیونکہ لوگوں کی عدالت سے زیادہ انصاف اللہ کی عدالت میں ہوگا۔

اگر کسی کے دل میں دوسروں کی نعمتیں دیکھ کر تنگی محسوس ہو تو اسے چاہیے کہ وہ لوگوں کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے رب کی طرف متوجہ ہو۔ جو رب ایک بندے کو عطا کر سکتا ہے، وہ دوسرے بندے کو بھی عطا کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ بندوں کی نعمتوں کو گننے سے رزق نہیں بڑھتا، لیکن رب کے حضور جھکنے سے محرومیاں بھی نعمتوں میں بدل جاتی ہیں۔ حسد انسان کو شکوہ سکھاتا ہے، جبکہ دعا انسان کو شکر سکھاتی ہے، اور شکر وہ دولت ہے جس سے دل بھی مالا مال ہوتا ہے اور زندگی بھی۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قیامت کے دن مال و دولت کا حساب ہوگا، مگر زبان کا حساب اس سے بھی زیادہ باریک ہوگا۔ کتنے ہی لوگ ایسے ہوں گے جو اپنی نمازوں، روزوں اور نیکیوں کے ساتھ حاضر ہوں گے، لیکن دوسروں کی عزت پر حملے، غیبت، بہتان اور دل آزاری ان کی نیکیوں کو دوسروں میں تقسیم کر دیں گے۔ اس دن انسان کو معلوم ہوگا کہ ایک بے احتیاط جملہ بھی کس قدر مہنگا ثابت ہوسکتا ہے۔

اس لیے اپنے دل کو اتنا وسیع بنائیے کہ کسی کی کامیابی پر بے ساختہ "ما شاء الله، بارك الله" کہہ سکیں، اور اپنی زبان کو اتنا پاکیزہ بنائیے کہ وہ کسی کی عزت کو مجروح کرنے کے بجائے حوصلہ دینے، دعا کرنے اور خیر کی بات کہنے کی عادی بن جائے۔ جس دل میں دوسروں کے لیے خیر خواہی پیدا ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اسی دل کو سکون کی دولت عطا فرماتے ہیں، اور جس زبان سے دعائیں نکلتی ہیں، وہ زبان لوگوں کے دلوں میں بھی عزت پاتی ہے اور اپنے رب کے نزدیک بھی۔

آخر میں صرف اتنی سی بات اپنے دل میں اتار لیجیے کہ دوسروں کے عیب تلاش کرتے کرتے کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے سب سے بڑے عیب، یعنی اپنے نفس سے ہی غافل ہو جائیں۔ دانا وہ نہیں جو ہر شخص کی کمزوری پہچان لے، بلکہ حقیقی دانائی اس میں ہے کہ انسان اپنے نفس کی کمزوریوں کو پہچان کر ان کی اصلاح کی فکر کرے۔ اسی حقیقت کو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے نہایت جامع انداز میں بیان فرمایا: ”مؤمن اپنے بھائی کے لیے عذر تلاش کرتا ہے، جبکہ منافق اس کی لغزشیں تلاش کرتا ہے۔“ گویا ایمان کا تقاضا بدگمانی نہیں بلکہ حسنِ ظن، کردار کشی نہیں بلکہ خیر خواہی، اور غیبت نہیں بلکہ دعا ہے۔

یہ دنیا چند روزہ ہے۔ یہاں نہ کسی کی شہرت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اور نہ کسی کی بدنامی۔ باقی اگر کچھ رہنا ہے تو انسان کا کردار، اس کے اعمال اور وہ الفاظ جو اس کی زبان سے نکلے یا اس کے قلم سے رقم ہوئے۔ اس لیے دنیا میں عزت پانے کا آسان راستہ دوسروں کی عزت گرانا نہیں، بلکہ اپنے کردار کو اتنا بلند کرنا ہے کہ اگر مخالف بھی زبان کھولے تو اس کی بات دلیل نہ بن سکے۔

ہمارے مرشد حضرت مولانا شاہ محمد احمد پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ نے حسد پر بہت عمدہ شعر فرمایا ہے:

حسد کی آگ میں کیوں جل رہے ہو
کفِ افسوس کیوں تم مل رہے ہو
خدا کے فیصلے سے کیوں ہو ناراض
جہنم کی طرف کیوں چل رہے ہو

☆☆☆

ایک جائزہ

اشتراکیت

ایک ناکام نظام معیشت وسیاست

مولانا انیس احمد ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

اشتراکیت (Communism) نظام معیشت و معاشرت ہے نیز سیاست وحکومت بھی جو کارل مارکس اور فریڈرک اینجلس کے نظریات پر مبنی ہے جن کا یہ دعوی تھا کہ معاشرہ جب مختلف طبقات میں تقسیم ہوتا ہے تو بڑی ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں اور عمال اور سرمایہ داروں کے درمیان مستقل ایک کشمکش کا سبب بنتی ہیں اور اسی بنا پر ان کے درمیان طبقاتی جنگ جاری رہتی ہے، اس کا تجربہ گزشتہ صدی میں دنیا کے کئی ملکوں نے کیا اور خوب واویلا بھی مچایا کہ اسلام اس کا مخالف ہے، بیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ نظام اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ دنیا میں ظاہر ہوا اور ہر شخص کو اس قدر معتدل، متوازن، پیارا اور انوکھا محسوس ہوا کہ ہر شخص نہ صرف یہ کہ اسے اختیار کرنا چاہتا تھا بلکہ معتدل ترین نظام معیشت بتا کر اسے اختیار کرنے کی دعوت بھی دیتا تھا اور جو اسے اختیار نہ کرے اسے بیوقوف، قدامت پرست اور انسانیت دشمن تصور کیا جاتا تھا، بعض حلقوں کی طرف سے اسلام کو اس سلسلہ میں بہت بدنام کیا گیا، لیکن اہل علم وفضل اچھی طرح واقف ہیں کہ اسلام کا اپنا نہایت معتدل، متوازن معاشی نظریہ ہے جس پر وہ روز اول سے قائم وعمل پیرا ہے وہ ہر نئے آنے والے ازم کی طرف بھاگتا نہیں ہے، اسلام کا نظام معیشت اللہ کی طرف سے نازل کردہ اور ابدی ہے جس میں انسانوں کی فطرت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور انھیں آزادی کے ساتھ کمانے، خرچ کرنے، کھانے پینے، اور کھلانے پلانے کی مکمل آزادی دی گئی ہے۔

اللہ نے انسان کو اس روئے زمین پر بھیجا اور اس کی زندگی کی ضروریات کے مطابق معاش کے ذرائع پیدا فرمائے، انھیں انسان کے لئے تابع فرمان بنایا نیز اسے ان سے استفادہ کی صلاحیتیں عطا فرمائیں فرمایا: ﴿وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ﴾ (اور ہم نے تمہارے لئے روئے زمین پر معیشت کے اسباب پیدا فرمائے)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے بر و بحر، زمین و آسمان مسخر کیا تا کہ ان سے اپنی صلاحیت اور علم کے مطابق فائدہ اٹھائے، سب سے بڑی دولت علم عطا فرمایا جس کے ذریعہ دنیا میں مزید اسباب و ذرائع پیدا کرسکتا ہے، اسی علم کے ذریعہ انسان نے آسمان کی فضاؤں اور خلاؤں کو مسخر کیا، سمندر کے سینے کو چیر کر اس کی گہرائیوں میں اتر کر اس سے بھرپور استفادہ کیا، قرآن خود اس کی شہادت دیتا ہے ﴿وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (اور وہی (اللہ) ہے جس نے سمندر کو تمہارے لیے مسخر کردیا، تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ، اور اس میں سے ایسے زیورات نکالو جنہیں تم پہنتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں اس کے پانی کو چیرتی ہوئی چلتی ہیں، تاکہ تم اس کے فضل (رزق) کی تلاش کرو، اور تاکہ تم شکرگزار بنو)۔

قرآن دیگر کئی مقامات پر معیشت کے اسباب و ذرائع کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس سے استفادہ کی دعوت دیتا ہے، قرآن مختلف مقامات پر تجارت کرنے نیز ایمانداری اور شفافیت کے ساتھ تجارت پر زور دیتا ہے، مال کے حصول سے اسلام منع نہیں کرتا اور نہ ہی اسباب و ذرائع کے حصول سے روکتا ہے، ان کے حصول کے بعد اللہ انسان سے یہی چاہتا ہے کہ وہ اس کا شکرگزار بندہ بنا رہے اس کے خلاف سرکشی نہ کرے لیکن اکثر یہی دیکھا گیا کہ انسان دولت نیز علم وحکمت سے نوازے جانے کے بعد متکبر ہوجاتا ہے، اسے اپنی دولت اور علم وحکمت پر بیجا گھمنڈ وغرور ہوجاتا ہے اور وہ اللہ کے نظام میں خلل اندازی کرنے لگتا ہے اور یہیں پر اس سے دھوکا ہوتا ہے اور اس کی زندگی اس کے لئے وبال جان بن جاتی ہے۔

یہی واقعہ اشتراکیت کے ساتھ بھی پیش آیا، اللہ نے سب انسانوں کو علم، طاقت نیز فہم وفراست عطا فرمائی ہے، مواقع سے استفادہ کا برابر حقوق فراہم کیا ہے، ان کے اندر مختلف صلاحیتیں رکھی ہیں کچھ تو ان میں مکتسب ہوتی ہیں اور کچھ وہبی ہوتی ہیں، ہر انسان کا اپنا مذاق ومزاج بھی جداگانہ ہوتا ہے، اس کی فکر ونظر کا دائرہ بھی علیحدہ ہوتا ہے، ہر ایک کے اندر کسب وانفاق کی صلاحیت بھی مختلف ہوتی ہے جب یہ ایک حقیقت ہے تو سارے انسانوں کو ایک ہی لاٹھی سے کیسے ہانکا جاسکتا ہے، ان کو ایک مخصوص زاویہ نگاہ پر کیسے روکا جاسکتا ہے، ہر ایک کی ضرورتیں اور زندگی جینے کا رنگ وآہنگ بھی جداگانہ ہوتا ہے، ایسے میں اللہ کی طرف سے پیدا کردہ معیشت کے اسباب وذرائع کو چند لوگوں کے ہاتھ میں دے دینا یا حکومت کا انھیں اپنے قبضہ میں کرلینا اور ان سے ہونے والی آمدنی کو برابر برابر تمام لوگوں میں تقسیم کرنا خواہ وہ معاشرہ کی تشکیل وتعمیر میں کیسا بھی کردار ادا کیوں نہ کرے، سراسر ظلم وناانصافی ہوگی

اور اللہ کے نظام میں خلل اندازی ہے نہ کہ عدل و انصاف، اللہ فرماتا ہے: ﴿وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ، وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ، ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ﴾ (اور یہ کہ انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی۔ اور یہ کہ اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔ پھر اسے اس کا پورا پورا اور بہترین بدلہ دیا جائے گا۔)

انسان ذرائع معاش کو اپنی طاقت وقوت کے مطابق حاصل کرے گا اور اپنی زندگی کو اسباب و ذرائع کے مطابق بنائے گا اور سنوارے گا، ایک مزدور، ایک معمار، ایک انجینئر، ایک سائنٹسٹ، ایک پروفیسر، ایک حاکم، ایک محکوم، عالم و فاضل پڑھا لکھا اور ان پڑھ سب کو ایک ہی معیار پر رکھنا، اور سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا انصاف نہیں بلکہ انصاف کا مذاق ہے، اشتراکیت نے دنیا کو یہ باور کرایا کہ سب انسان برابر ہیں، اس لئے ان کے درمیان مساوات ہونی چاہئے، آمدنی اور پیداوار سب کے درمیان برابر برابر تقسیم ہونی چاہئے، اور آمدنی نیز پیداوار کے ذرائع حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہئے، یعنی اس پر حکومت کا کنٹرول ہو اور وہ اپنی طاقت کو استعمال کر کے لوگوں میں برابر تقسیم کا عمل انجام دے، اس طرح انسان نہ زیادہ کما سکے گا، نہ معیار زندگی بہتر بنا سکے گا اور نہ ہی نیک راستوں میں خرچ کر کے اپنی آخرت کو سنوار سکے گا اور نہ ہی معاشرہ کو بہتر اور پرامن بنانے میں اپنا مثبت اور تعمیری کردار ادا کر سکے گا۔

اشتراکیت کے منفی اثرات معاشرہ پر مرتب ہوئے کیونکہ اس میں ایک پارٹی کی حکومت ہوتی ہے اور سیاسی اپوزیشن پر سخت پابندیاں ہوتی ہیں، کمیونسٹ حکومتوں میں تقریر وتحریر، مذہب اور پریس پر پابندی ہوتی ہے، اس میں معاشی ناہمواریاں پائی جاتی ہیں، ایسی نظام معیشت میں کانزیومر (استعمال کئے جانے والی اشیاء) سامان کی کمی پائی جاتی ہے، سیاسی ضغط ودباؤ ایسے نظام میں بہت ہوتا ہے، لوگ آزادی رائ بھول جاتے ہیں، اس نظام میں انڈسٹریز اور دیگر صنعتوں کی، زمین اور فطری ذرائع کی ذاتی ملکیت ختم کردی جاتی ہے، پیداوار کے ذرائع پر معاشرہ کی یا ریاست کی اجتماعی ملکیت ہوتی ہے، معاشرہ کی طبقاتی تقسیم بالکل ختم کردی جاتی ہے، دولت کی تقسیم لوگوں کی ضرورتوں کے مطابق ہوتی ہے، اس کے آخری اسٹیج پر پہنچ کر ریاست بذات خود غیر ضروری سمجھ لی جاتی ہے، ظاہر ہے یہ نظام انسانی فطرت کے مکمل خلاف تھا اس لئے چند ممالک کو چھوڑ کر اکثر ملکوں سے یہ نظام ختم ہوگیا۔

زیادہ تر اشتراکی حکومتوں میں، حکومت مرکزی طور پر پیداوار، تعیین اسعار اور مبادلہ کی پلاننگ کرتی ہے، جس سے مارکیٹ کا کمپٹیشن ختم ہو جاتا ہے، لوگوں میں ابداع و اختراع کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے کیونکہ ان کے اندر نئی چیزیں پیدا کرنے کی ترغیب کم ہوجاتی ہے۔

افسران کے فیصلے میں سستی پائی جاتی ہے، اس بات کی تعیین میں بھی مشکلات پائی جاتی ہیں کہ لوگوں کو کن چیزوں کی زیادہ ضرورت ہے مثال کے طور پر ۱۹۷۰ سے ۱۹۸۰ کے درمیان سوویت یونین کی معاشیات بہ نسبت بہت ساری تیز رفتار ترقی کرتی ہوئی معاشیات کے مقابلہ میں سخت جمود، سست رفتاری، اور زوال پذیر منافست کا شکار تھی، شاید انھیں وجوہات کی بنا پر سوویت یونین کا زوال ہوا، کیونکہ وہاں پر کافی دنوں تک معاشی بحرانی کیفیت بنی رہی، سرد جنگ کے دوران فوجی مصارف بہت زیادہ ہوئے، زندگی کے معیار سے پبلک مطمئن نہیں تھی، نیز سوویت ریپبلک کے اندر ہی قومی تحریکیں وجود میں آئیں، میخائیل گورباچوف کے زمانہ میں اصلاحات کی کوششوں نے مرکزی کنٹرول کو کمزور کردیا جس نے کچھ دیگر مسائل کو بھی واضح کردیا، اس کے سقوط کی کوئی ایک خاص وجہ نہیں ہے بلکہ ایک ساتھ بہت سارے عوامل، مسائل، دباؤ اور پریشر کی وجہ سے ایسا ہوا جبکہ امریکہ خود اس کو کمزور کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے تھا۔

اسلام دین فطرت ہے، اس میں اللہ نے ساری انسانی فطرتوں کا خیال رکھا ہے، انسان کو خود قوت اختیار دیا ہے، اسے تسخیر کرنے، کنٹرول کرنے کی طاقت عطا فرمائی ہے، مختلف انسانوں کی ہمت و صلاحیت میں فرق ہوتا ہے، جب یہ حقیقت ہے تو کیسے سارے انسانوں کو ایک معیار پر منضبط کیا جاسکتا ہے، کیسے ان کے لئے ایک ہی معیار زندگی (living standard) طے کیا جاسکتا ہے اور ایسا کرنا اجباری ہوگا تو زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا، جبر وقہر تا دیر قائم نہیں رہتا، اس کے برخلاف اسلام نے انسانوں کو آزادی دی ہے کہ وہ اپنی ہمت و طاقت کے مطابق کام کریں، کمائیں اور کمانے کے ذرائع پیدا کریں، کھائیں کھلائیں اور اپنا خود معیار زندگی قائم کریں، فلاحی اور نیک کاموں میں خرچ کر کے اللہ کی محبوبیت حاصل کریں اور دوسروں کے دلوں میں اپنے لئے نیک جذبات پیدا کریں، ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لیں، علم سے خود آراستہ ہوں اور دوسروں کو آراستہ کریں، جبکہ اشتراکیت میں اس بات کی پابندی ہوتی ہے کہ آپ کیا پڑھیں کیا نہ پڑھیں، اس لئے اشتراکی نظام حکومت میں لٹریچر بھی محدود ہوتا ہے، اصل میں وہ پورے قوم کا ذہن اور فکر کا سانچہ ایک رکھنا چاہتے ہیں اس لئے وہ محدود انداز کے لٹریچر کو پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں۔

☆☆☆

اصلاحِ حال

استغفار کے برکات وفضائل

مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی (استاذ جامعہ اسلامیہ، بھٹکل)

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے ذرائع بے شمار ہیں، اس نے ہمیں اپنے عذاب سے ڈرایا ہے، تو ہمیں دنیا کی زندگی میں اس سے ڈرنا ہے، اس کو ناراض کرنے والی باتوں سے بچنا ہے، اسی پر بھروسہ رکھنا ہے، اسی کی طرف رجوع کرنا ہے، اس کے ساتھ حسنِ ظن رکھنا ہے، خوف اور امید کے ساتھ اسے پکارنا ہے، اور اس دن کو یاد رکھنا ہے جب ہمیں اس کے حضور کھڑا کیا جائے گا۔

اس کا لحاظ رکھنے اور اس سے ڈرنے کے نتیجے میں وہ ہمیں حق وباطل میں امتیاز کرنے کی قوت عطا فرمائے گا، ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے گا، ہمیں بخش دے گا، ہر مشکل سے نجات عطا فرمائے گا اور ایسی جگہ سے روزی عطا فرمائے گا جہاں ہمارا گمان تک نہ پہنچے گا۔ جیسا کہ مختلف آیات میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو توبہ اور استغفار کا مستقل حکم دیا ہے، کیوں کہ وہ بے حساب بخشنے والا اور نہایت مہربان ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿غَافِرِ الذَّنبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ إِلَيْهِ الْمَصِيرُ﴾ [غافر: ۳]

(وہ گناہوں کو بخشنے والا، توبہ قبول کرنے والا، سخت سزا دینے والا اور بڑے فضل والا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے)۔

جب رسول اللہ ﷺ کہ جن کے اگلے پچھلے تمام قصور اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیے تھے، خود فرمایا کرتے تھے:

"میں ایک دن میں سو مرتبہ اللہ سے استغفار کرتا ہوں۔"

تو پھر ہم جیسے گناہ گار بندے استغفار کے کس قدر محتاج ہیں!

قرآنِ کریم میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا اختتام اللہ تعالیٰ کے دو عظیم صفاتی ناموں "الغفور الرحیم" یا "غفور حلیم" پر ہوتا ہے، تاکہ بندوں کے دلوں میں اس کی مغفرت، رحمت، حلم اور عفو کی امید پیدا ہو، وہ اس کی اطاعت اختیار کریں، گناہوں سے بچیں اور کثرت کے ساتھ توبہ واستغفار کرتے رہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [البقرة: ۱۹۹]

"اللہ سے بخشش مانگو، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم فرمانے والا ہے۔"

نیز فرمایا: ﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾ [آل عمران: ۱۳۳]

"اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، جو اللہ کا لحاظ رکھنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔"

اسی طرح توبہ کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

﴿أَفَلَا يَتُوبُونَ إِلَى اللَّهِ وَيَسْتَغْفِرُونَهُ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [المائدة: ۷۴]

(کیا یہ لوگ اللہ کے حضور توبہ نہیں کرتے اور اس سے بخشش نہیں مانگتے؟ حالانکہ اللہ بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔)

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیائے کرام اور نیک بندوں کی یہ خوبی بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے رب سے مغفرت طلب کرتے رہتے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ * وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ * فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ [آل عمران: ۱۴۶-۱۴۸]

(کتنے ہی ایسے نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ اللہ والوں کی بڑی جماعتوں نے جہاد کیا۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر آئیں اس پر نہ انھوں نے ہمت ہاری، نہ کمزور پڑے اور نہ ہی انھوں نے عاجزی دکھائی، اور اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا صرف یہ تھی کہ: اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں اور ہمارے معاملات میں ہماری زیادتیوں کو معاف فرما، ہمارے قدم جما دے اور ہمیں کافروں کے مقابلے میں مدد عطا فرما۔ پس اللہ نے انھیں دنیا کا بہترین بدلہ بھی عطا فرمایا اور آخرت کا بہترین اجر بھی، اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)۔

اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور توبہ کی قبولیت صرف

زبان سے استغفار کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان سب سے پہلے گناہ کو چھوڑ دے، پھر نیک اعمال اختیار کرے، صدقہ خیرات کرے اور نیکی کی راہ میں ثابت قدم رہے۔ اسی لیے اہلِ علم نے فرمایا ہے:

''گناہ چھوڑے بغیر استغفار کرنا جھوٹوں کی توبہ ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَى﴾ [طٰه: ۸۲]

(میں یقیناً اسے خوب بخشنے والا ہوں جو توبہ کرے، ایمان لائے، نیک عمل کرے، پھر سیدھی راہ پر قائم رہے۔)

اسی طرح فرمایا: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَى وَالْمَسَاكِينَ وَ الْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَ لْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾ [النور: ۲۲]

(تم میں سے وسعت اور فضیلت والے لوگ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے قرابت داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہیں کریں گے، بلکہ انھیں چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر سے کام لیں۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمھیں بخش دے؟ اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم فرمانے والا ہے۔)

نیز فرمایا: ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ [المائدة: ۹] (اللہ نے ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔)

اسی طرح فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ﴾ [الملك: ۱۲] (جو لوگ بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ بارش کی دعا کے لیے نکلے، مگر انھوں نے دعا کے بجائے صرف استغفار کیا۔ لوگوں نے عرض کیا: امیر المؤمنین! آپ نے تو بارش کی دعا نہیں کی؟ آپ نے فرمایا:

''میں نے ان کنجیوں کے ذریعے بارش طلب کی ہے جن سے آسمان کے خزانے کھولے جاتے ہیں۔''

پھر آپ نے وہ آیات تلاوت فرمائیں جن میں استغفار کے نتیجے میں بارش نازل ہونے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

﴿اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا﴾ [نوح: ۱۰-۱۱]

''اپنے پروردگار سے استغفار کرو، یقینا وہ بڑا بخشنے والا ہے، وہ تم پر موسلا دھار بارش بھیج دے گا''۔

نیز ﴿وَاسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ﴾ [هود: ۹۰]

اور اپنے پروردگار سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرو پھر اسی کی طرف رجوع کرو''۔

اسی طرح حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے پاس ایک شخص آیا اور قحط سالی کی شکایت کرنے لگا تو آپ نے فرمایا: اللہ سے استغفار کرو۔

دوسرا شخص آیا، اس نے غربت کا شکوہ کیا، فرمایا: استغفار کرو۔

تیسرے نے اپنے باغ کی خشک سالی بیان کی، فرمایا: استغفار کرو۔

چوتھے نے اولاد نہ ہونے کی شکایت کی، فرمایا: استغفار کرو۔

استغفار کی فضیلت کے بارے میں بہت سی احادیث بھی وارد ہوئی ہیں۔ ان میں وہ حدیثِ قدسی بھی ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اے میرے بندو! تم رات دن خطائیں کرتے رہتے ہو، اور میں تمام گناہوں کو بخشنے والا ہوں، لہٰذا مجھ سے بخشش مانگو، میں تمھیں بخش دوں گا۔'' (صحیح مسلم)

ایک اور حدیث قدسی میں ارشاد ہوتا ہے:

''اے ابنِ آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائیں، پھر تو مجھ سے مغفرت طلب کرے، تو میں تجھے بخش دوں گا اور مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہوگی۔'' (ترمذی)

یعنی بندہ خواہ کتنے ہی بڑے گناہوں میں مبتلا کیوں نہ ہو، اگر وہ سچے دل سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ اور استغفار کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے بے پایاں فضل و کرم سے اس کے تمام گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔

بس توبہ کی دیر ہے، ادھر بندے نے سچے دل سے توبہ کی اور ادھر بارگاہِ رب میں وہ باریاب ہوئی اور پل بھر میں وہ گنہگاروں کی فہرست سے نکل کر مقبولین بارگاہ کی صف میں پہنچ گیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ایک بندے سے گناہ سرزد ہوا، اس نے عرض کیا: اے میرے رب! مجھ سے گناہ ہوگیا، مجھے معاف فرما۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور اس پر گرفت بھی کرتا ہے، لہٰذا میں نے اسے بخش دیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد اس سے دوبارہ گناہ ہوگیا، اس نے پھر مغفرت مانگی، اللہ تعالیٰ نے پھر فرمایا: میرے بندے نے اپنے رب کو پہچان لیا ہے، چنانچہ میں نے اسے پھر بخش دیا۔" (متفق علیہ)

☆☆☆

آدابِ زندگی

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی، مگر تم کیا ہو؟

مولانا محمد ناظم اشرف ندوی (مفتی دارالافتاء، ادارہ شبابِ اسلامی، دہرہ دون)

قرآنِ مجید بار بار انسان کو اس کے نسب، خاندان اور ماضی کے بجائے اس کے اپنے عمل کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ﴾ (البقرة: ۱۳۴) یعنی ''وہ ایک امت تھی جو گزر چکی، اس کے لیے وہ ہے جو اس نے کمایا، اور تمہارے لیے وہ ہے جو تم کماؤ گے۔''

یہ آیت ہمیں ایک عظیم حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ گزشتہ نسلوں کی عظمت، قربانیاں، علم، تقویٰ اور خدمات اپنی جگہ قابلِ احترام ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں ہماری کامیابی کا معیار ہمارے اپنے اعمال ہیں، نہ کہ ہمارے آباؤ اجداد کے شاندار ماضی پر فخر کرنا۔

جب ہم صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیاں پڑھتے ہیں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بے مثال قربانی اور عہدِ وفا، حضرت عمر فاروقؓ کا عدل و انصاف، حضرت عثمان غنیؓ کی سخاوت و فیاضی، حضرت علیؓ کا علم و شجاعت، حضرت خالد بن ولیدؓ کی بہادری و جاں بازی، حضرت مصعب بن عمیرؓ کی ایثار و قربانی، حضرت بلالؓ کی استقامت و پائیداری اور دیگر صحابہ کی بے شمار قربانیاں ہمارے سامنے آتی ہیں، پھر تابعین اور تبع تابعین کی وہ جماعت سامنے آتی ہے جس نے علم و عمل، زہد و تقویٰ اور دعوت و عزیمت کے ذریعے اسلام کی روشنی کو دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچایا۔ انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ائمۂ مجتہدین، محدثین، مفسرین، فقہاء اور اولیائے کرام نے اپنی زندگیاں دین کی خدمت میں کھپا دیں۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور بے شمار اکابر علماء و مشائخ نے علم و عمل کی ایسی مثالیں قائم کیں جن پر امت آج بھی فخر کرتی ہے۔

ہمارے ان بزرگوں کی زندگیاں یقیناً ہمارے لیے سرمایۂ افتخار ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ کیا صرف فخر کرنا کافی ہے؟ نہیں۔

اس لیے کہ اگر کوئی شخص اپنے باپ کی بہادری پر فخر کرے لیکن خود بزدل ہو، اپنے دادا کی دیانت پر فخر کرے مگر خود خائن ہو، اپنے اسلاف کے علم پر فخر کرے مگر خود جاہل یا علم سے کورا ہو، تو اس کا یہ فخر اسے کیا فائدہ دے سکتا ہے؟

اسی لیے رسولِ پاک ﷺ نے بھی فرمایا:

''مَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ''۔

یعنی جس کے عمل نے اسے پیچھے رکھا، اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکتا۔''

یہ حدیث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت و فضیلت کا معیار صرف تقویٰ اور صالح اعمال ہیں، نہ کہ صرف عظیم خاندان یا روشن ماضی پر فخر و غرور کرنا اور اس پر ڈینگیں مارنا۔

آج ہماری ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ ہم اپنے اسلاف کی عظمت کے قصے تو بڑے شوق سے سناتے ہیں، مگر ان کے اوصاف کو اپنی زندگی میں پیدا کرنے کی کوشش کم کرتے ہیں۔ ہم امام بخاریؒ پر فخر کرتے ہیں مگر علم کے لیے ان جیسی محنت نہیں کرتے، ہم حضرت عمرؓ کے عدل و انصاف کے قصے سناتے ہیں مگر اپنے معاملات میں انصاف سے کام نہیں لیتے، ہم حضرت عثمانؓ کی سخاوت بیان کرتے ہیں مگر اپنے مال میں محتاجوں کا حق ادا کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں، ہم حضرت بلالؓ کی استقامت کی تعریف کرتے ہیں مگر معمولی آزمائش میں حق کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل ہمیں کامیابی نہیں دے سکتا۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب تک مسلمانوں نے اپنے اسلاف کے کردار کو اپنایا، دنیا ان کے قدموں میں تھی، اور جب انہوں نے صرف ماضی پر فخر کرنا شروع کیا اور عمل کو چھوڑ دیا تو زوال ان کا مقدر بن گیا۔ امتیں صرف تاریخ سنانے سے زندہ نہیں رہتیں بلکہ تاریخ بنانے سے زندہ رہتی ہیں۔

اس لیے آج ہر مسلمان کو اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ میں صحابہؓ پر فخر کرتا ہوں، لیکن کیا میری نماز ان جیسی ہے؟ میں تابعین کی تعریف کرتا ہوں، لیکن کیا میرا علم حاصل کرنے کا جذبہ ویسا ہے؟ میں اکابرِ امت کی خدمات بیان کرتا ہوں، لیکن کیا میری زندگی دین کی خدمت کے لیے وقف ہے؟ میں اسلام کی عظمت کے نعرے لگاتا ہوں، لیکن کیا میرا کردار اسلام کی نمائندگی کرتا ہے؟

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کو صرف تاریخ کی کتابوں میں نہ رکھیں بلکہ ان کی سیرت کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنائیں، یہی ان کے ساتھ حقیقی محبت و عقیدت ہے اور یہی ان کی قربانیوں کا ہم پر حق ہے۔

☆☆☆

دین وایمان

فکروعمل کی تشکیل میں عقیدہ کی اہمیت

مولانا محمد وثیق ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

ہندوستان ایک سیکولر، جمہوری اور سوشلسٹ طرزِ حکومت پر قائم ملک ہے، ہندوستان کے دستور سازوں نے ملک کی بنیاد انھی تین اصولوں پر استوار کی، کیونکہ ہندوستان ایک ایسا بڑا ملک ہے جہاں مختلف مذاہب، متعدد قومیتیں اور متنوع تہذیبیں باہم زندگی گزار رہی ہیں، اس کے باشندوں میں ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی اور دیگر مذاہب کے پیروکار شامل ہیں اور ہر مذہب اپنے عقائد، تعلیمات، اخلاقی اقدار اور طرزِ حیات کے اعتبار سے دوسرے سے نمایاں طور پر الگ ہے، اسی طرح جین، بدھ اور سکھ مذاہب بھی اپنی جداگانہ مذہبی شناخت رکھتے ہیں، بلکہ خود ہندو معاشرہ بھی بے شمار فرقوں اور طبقات میں منقسم ہے، جن میں سے بہت سے اپنی مستقل مذہبی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں مذہبی تنوع ہی نہیں، بلکہ نسلی، لسانی، تہذیبی اور تاریخی اختلافات بھی نہایت گہرے ہیں، شمال اور جنوب کے درمیان نمایاں تہذیبی و تمدنی فرق پایا جاتا ہے، جبکہ ملک کے مختلف علاقوں میں آباد قبائل اپنی تہذیب، رسم و رواج اور طرزِ زندگی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہیں، اس کے علاوہ یہاں طبقاتی تقسیم بھی ایک تلخ حقیقت ہے، جو بعض اوقات شدید کشیدگی، تصادم اور خون ریزی تک کا سبب بن جاتی ہے، انھی حقائق کے پیشِ نظر ہندوستان کے دستور سازوں نے طبقاتی تفاوت کے خاتمہ کو اپنی بنیادی ترجیحات میں شامل کیا، پسماندہ طبقات کی ترقی اور انھیں مساوی مواقع فراہم کرنے کے لیے آئینی اقدامات کیے، اور ہندوستانی دستور میں ہر قسم کے نسلی اور طبقاتی امتیاز کو صراحت کے ساتھ ممنوع قرار دیا۔

ہندوستان کا دستور مذہب، نسل، رنگ، طبقہ اور جنس کی بنیاد پر ہر قسم کے امتیاز کی نفی کرتا ہے، وہ تمام باشندوں کے لیے مساوی حقوق اور یکساں مواقع کی ضمانت دیتا ہے، امتیازی سلوک کو قابلِ تعزیر جرم قرار دیتا ہے، اور لسانی، مذہبی، ثقافتی اقلیتوں نیز قبائلی برادریوں کو یہ آئینی تحفظ فراہم کرتا ہے کہ وہ اپنی جداگانہ شناخت، تہذیبی خصوصیات اور مذہبی روایات کو محفوظ رکھتے ہوئے ترقی کریں، نشوونما پائیں اور اکثریتی معاشرے میں ضم ہو کر اپنی شناخت سے محروم نہ ہوں، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندوستانی معاشرے کے اس تصور کی ترجمانی کرتے ہوئے، جسے دستور کی روح قرار دیا جا سکتا ہے، یہ تاریخی نعرہ دیا تھا: ''تنوع میں وحدت'' ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ آئینی اصول ملک کے اجتماعی مفاد اور اس کے مخصوص سماجی، مذہبی اور تہذیبی مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ تھے، دستور سازوں نے انھیں ہندوستان کے متنوع معاشرہ کی ناگزیر ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اختیار کیا تھا، اسی بنا پر مختلف ممالک کے قوانین کا نہایت گہرا اور تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد مرتب کیا جانے والا ہندوستانی دستور مختلف مذاہب، قومیتوں، طبقات اور ثقافتوں کے درمیان ہم آہنگی، باہمی احترام اور قومی یکجہتی پیدا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت کے اعتبار سے دنیا کے ممتاز ترین دستور میں شمار کیا جاتا ہے، آزادی کے بعد ملک کی اولین قیادت نے بھی اسی دستوری روح کو اپنا رہنما اصول بنایا اور قومی زندگی میں اس کے تحفظ اور فروغ کو اپنی بنیادی ذمہ داری سمجھا۔

لیکن گزشتہ بارہ برسوں میں صورتحال بالکل بدل گئی ہے، اب نسلی اور مذہبی امتیاز برتا جا رہا ہے، اقلیتوں، خصوصاً مسلم اقلیت کو حاشیے پر دھکیلنے کی منظم کوششیں کی جا رہی ہیں، مسلمانوں کی زندگی کو دشوار بنانے، ان کے تاریخی آثار و تشخص کو مٹانے، دینی شعائر کو محدود کرنے، مذہبی تعلیم پر قدغن لگانے، مساجد اور مدارس کو بلڈوز کرنے اور اسلامی تشخص و دینی شناخت کو کمزور کرنے کے لیے باقاعدہ تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں، تعلیمی نصاب میں ایسے مضامین شامل کیے جا رہے ہیں جو مسلمانوں کے عقیدہ سے متصادم ہیں، ذہنوں کو گمراہ کرتے ہیں، جذبات کو مشتعل کرتے ہیں اور تاریخ کو مسخ شدہ انداز میں پیش کرتے ہیں، معمولی اور بے بنیاد باتوں کے تحت مسلمانوں کے مکانات منہدم کیے جاتے ہیں، غیر قانونی گرفتاریاں عمل میں آتی ہیں، اظہارِ رائے کی آزادی سلب کی جاتی ہے اور جس شخص میں دینی

حمیت محسوس ہو اسے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی ماب لنچنگ کی جاتی ہے، انہیں انتخابی عمل سے دور رکھنے اور ان کے حق رائے دہی کو محدود کرنے کی منصوبہ بند کوششیں کی جاتی ہیں، حکومت، انتظامیہ اور سرکاری ملازمتوں میں ان کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے اقدامات کیے جاتے ہیں، اور یکساں سول کوڈ کو جبراً نافذ کرنے کی راہ ہموار کی جا رہی ہے بلکہ بعض ریاستوں میں نافذ کر دیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اقتدار کے ایوانوں میں ایسے عناصر سرایت کر چکے ہیں جو ملک کو ایک خالص ہندو اسٹیٹ میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں، اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف ہندو تنظیمیں اور تحریکیں سرگرمِ عمل ہیں اور حکومت ان تحریکوں کی سرپرستی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے؛ انہیں قوت، تحفظ اور پشت پناہی فراہم کی جاتی ہے، یہ جانب داری سیاست، تعلیم، میڈیا، انتظامیہ اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

تعصب و تنگ نظری کی لہر روز بروز شدت اختیار کرتی جا رہی ہے، بعض تنظیمیں معاشرے پر ہندو تہذیبی رنگ غالب کرنے کی علانیہ دعوت دے رہی ہیں اور یہ مطالبہ کر رہی ہیں کہ تمام اقلیتیں اسی رنگ میں رنگ جائیں، حالاں کہ یہ مطالبہ ہندوستان کے سیکولر دستور کی روح اور اس کے بنیادی تصورات سے صریحاً متصادم ہے، یہ تنظیمیں مسلمانوں کو نفرت اور بدگمانی کی نگاہ سے دیکھتی ہیں، حکومت پر دباؤ ڈالتی ہیں کہ مسلمانوں کو اقلیت ہونے کی بنیاد پر حاصل تمام آئینی حقوق واپس لے لیے جائیں، اور مختلف تدبیروں کے ذریعے مسلمانوں میں عدمِ تحفظ اور بے اطمینانی کا احساس پیدا کیا جائے، ان کی کوشش ہے کہ مسلمانوں کو اقتدار، فیصلہ سازی، اثر و رسوخ اور قوت کے تمام مراکز سے بتدریج بے دخل کر دیا جائے، چونکہ پولیس، انتظامیہ، عدلیہ اور تعلیمی اداروں میں بھی متعصب عناصر کا اثر و نفوذ بڑھتا جا رہا ہے، اس لیے جب مسلمان کسی ظلم، زیادتی یا تشدد کا نشانہ بنتے ہیں تو اکثر انھیں انصاف نہیں ملتا، بلکہ الٹا انہی کے خلاف مقدمات قائم کیے جاتے ہیں اور ملک میں پیدا ہونے والی بدامنی، انتشار اور اضطراب کا ذمہ دار بھی انہی کو قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یقیناً یہ حالات مسلمانوں کے اندر مایوسی اور خوف پیدا کرتے ہیں، لیکن یہ آزمائش کی گھڑیاں دیرپا نہیں، یہ دشواریاں عارضی ہیں اور ہمارے دیکھتے دیکھتے ابتلاء کا یہ موسم گزر جانے والا ہے، بشرطیکہ مسلمان صبر وضبط سے کام لیں، استقامت کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھیں، ثابت قدمی، کردار کی بلندی اور حسنِ عمل کا ثبوت دیں، مسائل کو ٹھنڈے دماغ سے حل کرنے کی کوشش کریں، خدا پر پورا اعتماد رکھیں، باہمی اتحاد و اتفاق پیدا کریں، فکری، جماعتی، فقہی اور مسلکی اختلافات کو پسِ پشت ڈال دیں اور ان کو ایک صاحب فکر، متوازن دماغ، حقیقت پسند لیکن جری و بے خوف قیادت میسر آ جائے، لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس ملک میں اپنی ملی خصوصیات، اسلامی تہذیب، دینی شعائر، اخلاقی اقدار اور اسلامی تشخص کے ساتھ باوقار زندگی گزارنے کا عزم کریں، انھیں اپنے دین کے کسی بھی شعار سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے، نہ ہی اپنی مذہبی و تہذیبی شناخت سے عاری ہو کر زندگی بسر کرنی چاہیے۔ ان کا شیوہ یہ ہو کہ عزت، وقار اور خودداری کے ساتھ زندگی گزاریں، نہ کہ سدھائے ہوئے جانوروں یا پالے ہوئے کتوں کی طرح صرف کھانے پینے، تنخواہوں کے تحفظ، ملازمتوں کے حصول اور مادی آسائشوں کو آزادی اور کامیابی کا معیار سمجھ بیٹھیں، انھیں اس طرزِ زندگی اور اس مادہ پرستانہ فکر کو یکسر مسترد کر دینا چاہیے۔ اسی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلامی تعلیم کے موضوع پر ۴/اور ۵/جون ۱۹۶۱ء کو لکھنؤ میں منعقدہ تعلیمی کانفرنس سے اپنے خطاب میں کہا:

''ہم اس ملک میں غلام بن کر نہیں رہیں گے، ہم اس ملک میں برابر کے شریک ہیں، اس ملک کے معمار اور محسن ہیں، اس ملک کی عزت اور اس کے دستور و آئین کے سلسلہ میں دنیا کی کوئی طاقت ہم کو ہمارے اس فطری اور آئینی حق سے محروم نہیں کر سکتا، غلامی اور سامراج کا زمانہ ختم ہو گیا، آج نہ قوموں کا سامراج برداشت کیا جائے گا، نہ زبانوں اور تہذیبوں کا، آج ساری دنیا ایک گھر بن گئی ہے، آج ملک کی بے آئینی چھپی ڈھکی نہیں رہ سکتی، دنیا کا ضمیر بیدار ہو چکا ہے۔

آیئے اس مبارک وقت میں کہ رات آخری ہو رہی ہے، اور خدا کی رحمت کے نزول کا وقت ہے، سچے دل سے عزم اور عہد کریں کہ ہم کو اس ملک میں اپنی اسلامیت کے ساتھ رہنا ہے، اور اپنی آئندہ نسلوں کی اسلامیت کا یقین حاصل کرنا ہے، اور پھر اس راہ میں اگر آزمائشیں پیش آئیں تو ان کو گوارا کرنا ہے، لیکن اس صراط مستقیم سے بال برابر بھی نہیں ہٹنا ہے، قرآن مجید میں مسلمانوں کے دو ہی گروہوں کے وجود کو تسلیم کیا

گیا ہے، اور انہیں کا محبت وعزت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، ایک وہ گروہ جس نے اپنے عہد کو پورا کردیا اور خدا سے جو نذر کی تھی وہ وفا کی اور دوسرا وہ جو اپنے عہد پر قائم ہے، اور اس سے انحراف کو قبول کرنے کو تیار نہیں "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا" (سورہ احزاب: ۲۳)۔

''اہلِ ایمان میں سے کچھ وہ ہیں جنہوں نے اللہ سے کیا ہوا اپنا عہد سچ کردکھایا۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جو ابھی انتظار میں ہیں اور انہوں نے اپنے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں کی'' (ماخوذ از: تکبیر مسلسل، مرتب ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی)۔

آج ہندوستان کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اسلام کے پاکیزہ وخالص عقیدۂ توحید کو اپنی پوری زندگی کا محور ومرکز بنائیں اور زندگی کے ہر شعبہ کو ایمان کے رنگ میں رنگ دیں، کیونکہ عقیدہ، اگر دل کی گہرائیوں میں اتر جائے، راسخ ہو جائے، تو وہ انسان کی پوری زندگی کا رخ متعین کردیتا ہے، اس کی منزل کا تعین کرتا ہے اور راہِ حق میں پیش آنے والی تمام آزمائشوں اور دشواریوں کو اس کے لیے آسان بنادیتا ہے، چنانچہ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ نے "البعث الاسلامی" (ربیع الاول ۱۴۰۱ھ) میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے: ''عقیدہ، خواہ کوئی بھی ہو، اگر دل میں مضبوطی کے ساتھ جاگزیں ہو جائے تو وہ انسان کی تقدیر کا فیصلہ کرتا ہے، اس کی زندگی کا رخ متعین کرتا ہے، اور اس کے راستے میں آنے والی تمام دشواریوں اور رکاوٹوں کو اس کے لیے آسان کردیتا ہے۔ یہی وہ عقیدہ تھا جس نے قرن اول کے مسلمانوں کی قیادت کی۔ اسی نے انہیں ایک برّ اعظم سے دوسرے برّ اعظم تک پہنچایا؛ وہ سمندروں کو عبور کرتے، جنگلوں سے گزرتے، بلند پہاڑوں کو سر کرتے، غلامی کی زنجیریں توڑتے اور حق کی آواز بلند کرنے اور عدل کا پرچم سربلند رکھنے کی خاطر دنیا کی ہر آسائش، ہر راحت اور ہر نعمت کو بے دریغ قربان کردیتے تھے، یہاں تک کہ یہی عقیدہ ان کی زندگی کی بنیاد بن گیا اور اس کی خاطر دی جانے والی ہر قربانی انہیں معمولی محسوس ہونے لگی، جبکہ راہِ حق میں پیش آنے والی ہر اذیت، ہر مشقت اور ہر سختی ان کے دلوں میں شیرینی اور لذت کا احساس پیدا کرتی تھی''۔

☆☆☆

اسلامی حکومتیں اور دینی پیشوائی کی سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی اس امت نے روئے زمین پر غلبہ واقتدار کے شرائط پورے کیے، اپنا مطلوبہ کردار ادا کیا تو اسے غلبہ وحکمرانی حاصل ہوئی، اور اس نے دنیا کی قیادت کی، تاریخ اسلامی میں جو بھی حکومت قائم ہوئی اس کی بنیاد دعوت الی اللہ، عقیدہ واخلاق کی اصلاح رہی ہے، لیکن جب مغربی تہذیب کا دور شروع ہوا، اور امت نے اس کے وسائل زندگی اور اس کے قائدین کے افکار وخیالات کی تقلید کی اور دعوت الی اللہ کا کام چھوڑ کر مادی تہذیب میں غرق ہوگئی تو یہ کمزوری اور زوال کا شکار ہوگئی، اور قیادت وسیادت دوسری قوم میں منتقل ہوگئی۔

تاریخ اسلامی کے مختلف ادوار کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب بھی اسلامی حکومت وجود میں آئی تو اس کے قیام میں اقتدار اور اس کے تقاضوں کے درمیان یہی مضبوط ربط وجوڑ کارفرما تھا اور اس کے زوال کا سبب اس کی سستی اور استخلاف فی الأرض کے تقاضوں سے انحراف رہا، اور یہ بار بار ہوا ہے، تاریخ کے ہر دور میں عبرت کا سامان موجود ہے۔ تاریخ اسلامی کی یہ عجیب بات ہے کہ ہر وہ حکومت جس نے کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام دیا، اس کا قیام دعوت اسلامی کے سایہ میں ہوا، غلبہ واقتدار دینی جذبہ ہی کے تحت حاصل ہوا، اور زوال اور پستی کا سبب ہمیشہ پرعیش زندگی اور تمدن کی ریل پیل رہا، اس کی مثال اندلس، مصر، بغداد، ہندوستان، ایران اور ترکی ہے، ان ممالک میں عظیم حکومتیں قائم ہوئیں اور صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں، حکمراں خاندانوں کے فرق سے یہ صورت حال ہر دور میں نظر آتی ہے، اسلامی حکومتوں کے عروج وزوال کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں کو یہ معلوم ہے کہ اسلامی حکومت اور غلبہ علماء اور دینی پیشواؤں کی سرپرستی ورہنمائی میں قائم ہوا، جب تک اسلامی حکومتیں علماء دین کی سرپرستی میں رہیں تو طاقت وقوت حاصل رہی، فتوحات اور حکومت کا دائرہ وسیع رہا، لیکن جب علماء اور دینی پیشواؤں کی سرپرستی نہ رہی، مادی ذہن کے حکمراں آگئے، علماء کا اثر ورسوخ ختم ہوگیا، اور ان کے فتووں کی توہین کی جانے لگی تو اسلامی حکومت کا دائرہ تنگ ہونے لگا، یہاں تک کہ امت مسلمہ اقتدار وقیادت کے منصب سے محروم ہوگئی، پوری اسلامی تاریخ اس کی گواہ ہے۔

☆☆☆

احتسابِ نفس

جرائم کا بڑھتا رجحان

مولانا محمد رافع ندوی (استاذ جامعہ اسلامیہ مظفر پور، اعظم گڑھ)

ملک کے حالیہ واقعات نے انسانی ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ بتیس درندے ایک معصوم بچی کے ساتھ زنا کا ارتکاب کرتے ہیں، ایک بیٹی نوکری کے لالچ میں اپنی ماں کو قتل کر دیتی ہے، اور ایک بیوی اپنے شوہر کو، جو دس برس بعد پردیس سے گھر لوٹتا ہے، اپنے آشنا کے ساتھ مل کر موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔ یہ اور اس جیسے شنیع و فظیع واقعات انسانی سماج کے لیے بدنما داغ ہیں، جو ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ آخر انسانوں کا یہ سماج اس قدر وحشی اور درندہ کیسے بن جاتا ہے؟ پھر یہ حقیقت سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ انسان اپنے اندر ملکوتی صفات کے ساتھ ساتھ وحشیانہ خصائل و اخلاق بھی رکھتا ہے۔ انسان کے اندر بیک وقت خیر و شر، دونوں کے رجحانات موجود ہوتے ہیں، اور اگر شومیِ قسمت سے ملکوتی صفات کا پہلو مغلوب ہو جائے تو پھر شیطانی صفات کو شر و فساد برپا کرنے، انسانی سماج کو داغ دار اور بدبودار بنانے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔ اس وقت انسان جنگل کے درندوں اور خونخوار بھیڑیوں سے بھی زیادہ وحشی اور سفاک ثابت ہوتا ہے۔ حالیہ واقعات اسی حقیقت کا اعلان ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ واقعات اپنی نوعیت کے نئے اور انوکھے ہیں؟ کیا یہ انسانیت سوز اور شرم ناک سانحات اپنی نوعیت کے آخری واقعات ہیں اور اب آئندہ اس طرح کے واقعات پیش نہیں آئیں گے؟ یہ بھی غور طلب ہے کہ ان روح فرسا سانحات کے پیچھے کارفرما فکر اور ذہن کیا سوچتا ہے؟ کیا ماضی میں ان مجرموں کو قرارِ واقعی سزا ملی ہے، اور کیا آئندہ بھی انہیں قرارِ واقعی سزا ملے گی؟ نیز، ان واقعات کا حقیقی ذمہ دار کون ہے؟

جواب بالکل واضح اور سامنے کا ہے، اور وہ یہ کہ ان واقعات کا ذمہ دار ہمارا بودا، بے ہودہ، کھوکھلا اور موقع پرست نظام ہے۔ ان اموات کا ذمہ دار، اس بربریت اور وحشت کا ذمہ دار ہمارا وہ قانون ہے، جس کے ہاتھ حقیقی مجرموں تک پہنچنے سے کانپتے ہیں، اور جو انصاف کی فراہمی اور قیامِ عدل کے نام پر بے گناہوں اور کمزوروں کو اپنا نشانہ بناتا ہے، جبکہ حقیقی مجرم ہمارے سماج میں آزادانہ دندناتے اور سر اٹھائے پھرتے نظر آتے ہیں۔

یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کسی بھی جرم پر قدغن لگانے اور خیر و فلاح، نیکی و بہبود کے بیج کو تناور درخت بنانے، نیز سماج کو درستی اور بہتری کی راہ پر ڈالنے کے لیے سب سے بنیادی اور پائیدار چیز خوفِ خدا ہے۔ وہ سماج اور وہ لوگ جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے، جو اپنے سے برتر ہستی کے سامنے جواب دہی کا تصور نہیں رکھتے، اور جو اپنے اعمال کی باز پرس پر ایمان نہیں رکھتے، ان سے بعید نہیں کہ وہ درندگی، انسانیت سوزی اور وحشت و بربریت کی تمام حدیں پھلانگ جائیں۔ ایسے لوگوں سے بڑے سے بڑا جرم اور گھناونے سے گھناونا گناہ بھی بعید نہیں۔

دوسری چیز، جو گناہ کے ہاتھ روکتی اور درندگی کے عزائم کو ناکام بناتی ہے، وہ قانون کی بالادستی ہے۔ جب تک قانون کی حقیقی بالادستی قائم نہیں ہوگی، جب تک قانون صحیح معنوں میں اپنا کام نہیں کرے گا، اور جب تک اس کے ہاتھ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے مجرموں کی گردن تک نہیں پہنچیں گے، یہ مجرم اسی طرح ہمارے سماج میں پنپتے رہیں گے اور سماجی تعفن اور سڑاند میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

پھر یہ برائی کسی مذہب و ملت، کسی جماعت و گروہ یا کسی فرقے و مسلک تک محدود نہیں رہتی۔ یہ درندگی، حیوانیت اور بربریت ہر اس شخص سے سرزد ہو سکتی ہے، جس کے اندر نہ خوفِ خدا ہو، نہ آخرت کا یقین، نہ قانون کا خوف اور نہ سماج و معاشرے کا لحاظ۔

اس صورتِ حال کے ذمہ دار وہ لوگ بھی ہیں جو زانیوں کو مالا پہنا کر ان کا استقبال کرتے ہیں، جو مجرموں کے لیے اقتدار کے ایوانوں تک راستہ ہموار کرتے ہیں، اور جو گناہ گاروں کے لیے اقتدار اور عہدوں کی کرسیاں پیش کرتے ہیں۔

ان حالات کے ذمہ دار قانون کے وہ ایوان بھی ہیں، جو محض اپنی گندی سیاست کی خاطر وحشی صفات رکھنے والے عناصر کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔

چنگاری یہ دیکھ کر نہیں بھڑکتی کہ سامنے کسی امیر کا گھر ہے یا غریب کا، کسی رئیس کا گھر ہے یا کسی مسکین کا۔ پاگل کتا یہ دیکھ کر نہیں کاٹتا کہ یہ میرا دوست ہے یا میرا دشمن۔ زہریلے عناصر سماج میں ہر ایک کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم جتنی جلدی اس حقیقت کو سمجھ لیں، اتنی ہی جلد اپنے سماج کو ایک بہترین اور مثالی سماج بنانے کی کوشش کریں، جہاں غیر انسانی سلوک، نفرت، تشدد، عدمِ مساوات اور بے حیائی کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

☆☆☆

عصر حاضر

دعوتِ انبیاء اور مخالفین کی نفسیات

مولانا عبدالسبحان ناخداندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)
پیشکش: ابوالحسن علی ندوی

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ علماء کو اللہ رب العزت نے ایک خاص مقام ومنصب سے نوازا ہے یہ منصب امامت وقیادت، اصلاح و ارشاد اور مختلف حالات میں امت کی رہنمائی کرنے، اور اسے جادہ حق پر لانے اور ان علوم کی حفاظت و پاسبانی کا ہے جو انبیاء علیہم السلام کی وراثت ہیں، ارشاد نبوی (علیہ الصلاۃ والسلام) ہے: إن العلماء ورثة الأنبياء، إن الأنبياء لم يورثوا ديناراً ولا درهماً إنما ورثوا العلم فمن أخذه أخذ بحظ وافر. (رواه الترمذي)

یہ وراثت صرف علم کی نہیں! بلکہ تمام صفات و کیفیات، مقاصد و اہداف اور ان کے حصول کی راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور مشکلات، یہاں تک کہ ان کوششوں کے نتیجے میں برآمد ہونے والے نتائج کی بھی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا بنیادی مقصد دعوت الی اللہ رہا ہے اور جب بھی اللہ کے یہ نیک بندے اس دعوت کو لے کر اپنی اپنی قوم کے پاس آئے تو ان کو سخت مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا، مختلف طبقات کے لوگوں نے ان کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں اور ان کی تکذیب میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن اللہ کی اس مقدس جماعت نے عزم واستقلال کے وہ نمونے پیش کیے جو تاریخ میں نایاب ہیں، اور یہ نمونے ہمیں جابجا قرآن کریم میں نظر آتے ہیں جو کہ ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔

اس مقدس جماعت کو یوں تو قسم قسم کے لوگوں کے عناد وتشدد سے دوچار ہونا پڑا لیکن ان میں بنیادی طور پر چار طرح کے طبقات قابل ذکر ہیں:

۱- پہلا طبقہ اہل سیاست واقتدار کا ہے جس کو اپنی طاقت وقوت اور لوگوں کے درمیان اپنی جھوٹی عزت پر بڑا ناز رہتا ہے اور وہ کسی قیمت پر اس جاہ وحشم کو قربان کرنے کے روادار نہیں ہوتے، چنانچہ حضرت ابراہیم، حضرت نوح، حضرت موسیٰ اور دیگر انبیاء علیہم السلام جب دعوت حق لے کر آئے تو معاندین کی صف اول میں اسی طبقے کو پایا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت اور بادشاہ وقت نمرود کی مخالفت وتکذیب کا ذکر قرآن یوں کرتا ہے:

"أَلَمْ تَرَ إِلَى ٱلَّذِى حَآجَّ إِبْرَٰهِـۧمَ فِى رَبِّهِۦٓ أَنْ ءَاتَىٰهُ ٱللَّهُ ٱلْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ رَبِّىَ ٱلَّذِى يُحْىِۦ وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا۠ أُحْىِۦ وَأُمِيتُ ۖ قَالَ إِبْرَٰهِـۧمُ فَإِنَّ ٱللَّهَ يَأْتِى بِٱلشَّمْسِ مِنَ ٱلْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ ٱلْمَغْرِبِ فَبُهِتَ ٱلَّذِى كَفَرَ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلظَّـٰلِمِينَ" (سورۃ البقرۃ ۲۵۸)۔

(کیا اسے آپ نے نہیں دیکھا جس کو اللہ نے بادشاہت دے دی تو وہ ابراہیم سے ان کے رب کے سلسلہ میں حجت کرنے لگا جب ابراہیم نے کہا میرا رب تو وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، وہ بولا میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، ابراہیم نے کہا کہ یقینا میرا رب سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے تو مغرب کی سمت سے اسے لے آ، بس وہ کافر مبہوت ہو کر رہ گیا اور اللہ بے انصافوں کو راستہ نہیں دکھاتا)۔

فرعون اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے کوئی ناآشنا نہیں!

اسی طرح ہمارے آخری نبی حضرت محمد مصطفی ﷺ جب منصب نبوت سے سرفراز ہوئے اور نورِ نبوت سے عالم تاریک کو روشن کرنے کی سعی شروع کی تو مکی دور میں ابوجہل و ولید ابن عقبہ اور دیگر سرداران قریش کی عداوتیں جھیلنی پڑیں اور مدنی دور میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی آپ ﷺ کے خلاف کمر بستہ ہو گیا اور اپنی پوری عمر اسلام کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں ضائع کر دی، اور اس کی دشمنی کا بنیادی سبب یہ تھا کہ اہل یثرب جب اس کی قیادت کو تسلیم کرنے ہی چلے تھے عین اسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد ہوئی اور اس منافق کو اپنی قیادت کھٹائی میں پڑتی نظر آنے لگی۔

۲- دوسرا طبقہ اہل ثروت کا ہے جو دولت کے نشے میں ایسا مست ومگن رہتا ہے کہ حق بات سننے، اس کو تسلیم کرنے، بلکہ اس کے بارے میں سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا، اور اگر کچھ سوچتا بھی ہے تو ان غریب ونادار حاملین حق کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور شیر وشکر ہو جانا اس کو بڑا گراں بار محسوس ہوتا ہے اور نبی وقت کے سامنے اس کو عذر بنا کر ان سے دامن چھڑانے کا مطالبہ کرنے لگتا ہے، لیکن دین کسی کی جاگیر نہیں! بلکہ ہر ایک اس کے سائے تلے آ کر ایمانی ہواؤں کے سرد جھونکوں سے لطف اندوز ہونے کا پورا حق رکھتا ہے، قرآن کریم حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ ذکر کرتا ہے، جب انہوں نے اپنی قوم کو دعوت حق دی تو انہوں نے جواب دیا: أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ" بھلا

ہم تم پر ایمان لائیں گے جبکہ تمہاری پیروی تو بہت ہی گھٹیا لوگوں نے کی ہے۔ (سورۃ الشعراء ۱۱۱)

اسی طرح ہمارے نبی حضرت محمد مصطفی ﷺ نے جب حق کی ندا لگائی تو مشرکین مکہ اس کی تردید میں طرح طرح کی سازشوں اور دسیسہ کاریوں میں لگ گئے، ولید بن عقبہ جو ایک مالدار آدمی تھا قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ سے اس کے بغض ونفرت، اس کے مکروفریب، غرور و تکبر، حرص وہوس اور اس کے انجام کا سورہ مدثر میں مفصل ذکر کیا ہے۔

۳۔تیسرا طبقہ اہل مذہب کا ہے جو اپنی جعلی و جھوٹی دینداری میں خودفریبی کا شکار ہوتا ہے اور عوام الناس کو بھی متاثر کرنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے اور ان کی نگاہ میں اپنی بزرگی جما کر اور ان کے دلوں میں اپنی عقیدت بٹھا کر ذہنوں کو مسحور کرتا ہے، اور نفسانی خواہشات کے مطابق دین میں رد و بدل کرتے کرتے دین کے تخت شاہی کو تختہ بلکہ تختی میں تبدیل کر دیتا ہے اور جب اس کے پاس کوئی نبی، کوئی رسول یا کوئی مصلح ومجدد آتا ہے تو خود بھی اس کی دعوت کو ٹھکرا کر حرماں نصیبی کا شکار ہوتا ہے اور دوسروں کی بھی محرومی کا سبب بنتا ہے اور پھر مخالفت میں محاذ آرائی شروع کر دیتا ہے، چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کی بھی مخالفت ہوئی اور اس کو مذہبی رنگ دے کر لوگوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش کی گئی قرآن مجید قوم نوح کا واقعہ نقل کرتا ہے:

"قَالَ نُوحٌ رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَن لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَارًا، وَمَكَرُوا مَكْرًا كُبَّارًا، وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا۔"

(نوح نے کہا کہ اے میرے رب انھوں نے میری تو نافرمانی کی اور اس کے پیچھے ہو لیے جس کو اس کے مال اور اولاد نے سوائے نقصان کے اور کچھ نہ دیا، اور انھوں نے بھاری بھاری چالیں چلیں، اور بولے کہ اپنے معبودوں کو ہرگز مت چھوڑنا، ہرگز ہرگز وُدکو نہ چھوڑنا اور نہ سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو) (سورہ نوح)۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ اللہ رب العزت کے پیغام کو لے کر مدینہ طیبہ پہنچے اور اہل مدینہ پروانہ وار آپ ﷺ پر نچھاور ہونے لگے تو ابو عامر الراہب جو بڑا مذہبی پیشوا مانا جاتا تھا اور اس کی بزرگی کے بڑے چرچے تھے اور خود اس کو اس کا بڑا غرہ تھا اس کو جب اسلام کی تاباں و درخشاں تعلیمات کی روشنی میں لوگوں کے سامنے اپنے راز ہائے سربستہ واشگاف ہوتے نظر آنے لگے تو اس نے اہل اسلام کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور مشرکین مکہ کو حضور ﷺ کے خلاف محاذ آرائی پر آمادہ کر کے ان کے ساتھ برسر جنگ حاضر ہوا، یہی ابو عامر ہے جس نے منافقین کو مدینے میں اپنے لیے اڈا قائم کرنے پر تیار کر کے ایک مسجد تعمیر کرائی جس کے ذریعہ وہ اپنے ناپاک ارادوں کو بروئے کار لا سکے، اس کا ذکر قرآن مجید یوں کرتا ہے:

"وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ وَإِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ مِن قَبْلُ ۚ وَلَيَحْلِفُنَّ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا الْحُسْنَىٰ ۖ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ"۔

(اور جنھوں نے مسجد بنائی نقصان پہنچانے کے لیے اور کفر کے لیے اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالنے کے لیے اور اس شخص کو کمین گاہ فراہم کرنے کے لیے جو پہلے سے ہی اللہ اور اس کے رسول سے لڑتا رہا ہے اور قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم نے تو صرف بھلائی ہی کا ارادہ کیا تھا اور اللہ گواہ ہے کہ وہ پکے جھوٹے ہیں)۔

۴۔چوتھا طبقہ اہل علم کا ہے اور یہ وہ طبقہ ہے جس کا معاشرے کی صلاح وفلاح اور ناکامی و محرومی میں بڑا حصہ ہوتا ہے ان کے رخ کی درستگی معاشرے کی سرخروئی کا سبب بنتی ہے اور ان کی کجروی معاشرے کی ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اور علم جب مادہ پرستوں اور نہ خدا شناسوں کے ناپاک ہاتھوں میں آتا ہے تو وہ علم جو انسانیت کی نفع رسانی کا ذریعہ ہوتا ہے ان کے فاسد مقاصد کے حصول کا آلہ کار بن جاتا ہے اور پھر حق کی اتباع اس علم والوں کو مشکل سے مشکل تر محسوس ہونے لگتی ہے اور یہی ہوا ہے! جب بھی کوئی نبی حق لے کر آیا تو یہی اہل علم تکبر وہٹ دھرمی پر اتر آئے اور اپنے علم پر نازاں اور فرحاں ہونے لگے اسی کا ذکر قرآن مجید یوں کرتا ہے:

"فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ"۔

(بس جب ہمارے رسول ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو ان کو اپنے علم پر ناز ہوا اور بالآخر جس چیز کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی کی لپیٹ میں آ گئے)۔

اب جہاں تک ان مخالفتوں کی نوعیتوں کا معاملہ ہے تو وہ بھی مختلف قسم کی ہوا کرتی تھیں:

۱۔تکذیب محض: ہر قوم نے اپنے نبی کی تکذیب کھل کر کی ہے اور بلا تامل ہر نشانی کو جھٹلایا اور ہر معجزے کا انکار کیا ہے قرآن مجید میں اللہ رب العزت اپنے محبوب ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرماتا ہے: "فَإِن كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ

رُسُلٌ مِنۡ قَبۡلِكَ جاؤُ بِالۡبَيِّناتِ وَ الزُّبُرِ وَ الۡكِتابِ الۡمُنيرِ"۔

(پھر اگر انھوں نے آپ کو جھٹلایا تو آپ سے پہلے بھی رسول جھٹلائے جاچکے ہیں جو کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے)۔

۲۔استہزا: دوسرا طریقہ استہزا کا رہا ہے، چونکہ اکثر انبیاء علیہم السلام کے متبعین اولین مالی اور خاندانی اعتبار سے کمزور ہوا کرتے ہیں تم منکرین کا ٹولہ ان دیوانگان حق کا اور واضح اور کھلی نشانیوں اور خود انبیاء علیہم السلام کا مذاق اڑانے، ان کا تمسخر کرنے اور اس کے ذریعہ ان کو عار دلانے اور پھر ان کو دین حق سے برگشتہ و بیزار کرنے اور ان کے عزم و استقلال کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے قرآن مجید میں اللہ رب العزت فرماتا ہے:

"وَإِذَا رَأَوۡا آيَةً يَسۡتَسۡخِرُونَ" (۱۴)]

(اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو مذاق کا ماحول بناتے ہیں)(سورۃ الصافات)۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: "ذَٰلِكَ جَزَاؤُهُمۡ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا"۔

(ان کی سزا وہی دوزخ ہے اس وجہ سے کہ انھوں نے انکار کیا، اور میری آیتوں کا اور میرے رسولوں کا مذاق بنایا)(سورۃ الکہف)۔

۳۔اپنے عیب کو خوبی اور حسن بتانا: یہ بھی ہر قوم کا شیوہ رہا ہے کہ جب جب اس کے پاس کوئی نبی دعوت توحید لے کر آیا تو انہوں نے اپنے گمراہ کن نظریات، بت پرستانہ رسوم و رواج اور بے ہدی اعمال کو معیار حق و صداقت اور کامیابی کا ضامن قرار دیا، قرآن مجید میں ہے:

"بَلۡ قَالُوا إِنَّا وَجَدۡنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّهۡتَدُونَ"۔

(بلکہ ان کا کہنا تو یہ ہے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم بھی ان ہی کے پیچھے ٹھیک ٹھیک چل رہے ہیں)(سورۃ الزخرف)۔

۴۔دوسرے کی خوبی کو عیب بتانا اور ثابت کرنا: انبیاء علیہم السلام کی ایک بڑی خصوصیت دعوت کے میدان میں ان کا صبر و ثبات اور ان کی بلند حوصلگی ہے، جس کے آگے منکرین اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے ہیں اور جب اس کا کوئی توڑ سجھائی نہیں دیتا تو ان کے اس امتیاز کو جنون سے تعبیر کرنے لگتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالی کی طرف سے عطا کردہ معجزہ کو جادو کہہ کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالی اس کی صراحت کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"كَذَٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِن قَبۡلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوۡ مَجۡنُونٌ"۔

(اسی طرح ان سے پہلے جب بھی کوئی رسول آیا انھوں نے (اس کو) جادوگر یا مجنون بتایا)۔

اب ہم دور حاضر میں دیکھتے ہیں تو یہی چار طبقات اعداء اسلام کی جماعت میں پیش پیش نظر آتے ہیں، دنیا کی زمام قیادت جن ہاتھوں میں ہے ان کی اسلام دشمنی کوئی ڈھکی چھپی نہیں، یہی حال آج کے مالدار طبقے کا ہے اور یہی صورتحال اس طبقے کی ہے جو مذہبی بنا ہوا ہے جس نے دین کی تصویر اپنے معاش اور حصول دنیا کی خاطر بالکل مسخ کر دی ہے اور چند خرافات کو دین کا نام دے کر عوام کو اس کا دلدادہ و فریفتہ بنا دیا ہے اور اس کا مشاہدہ ہمیں آئے دن جگہ جگہ ہوتا رہتا ہے، لیکن ان سب سے بڑھ کر موجودہ دور میں جس طبقے نے سب سے زیادہ دین کو گزند پہنچانے کی کوشش کی ہے وہ اہل علم کا طبقہ ہے جس نے اپنا یہ شیوہ بنا لیا ہے کہ دین پر ایسے شدید حملے کیے جائیں کہ اہل دین کا اعتماد کمزور ہوتا چلا جائے اور اس کا سب سے بڑا مظہر جدید سائنس ہے جس کا استعمال آج مذہب کی مخالفت اور اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے میں کیا جا رہا ہے، لیکن اگر ہم قرآن کریم موجود ان رہنمائیوں کے استحضار کے ساتھ میدان عمل میں آئیں گے اور دین کی خاطر اپنے آپ کو کھپائیں گے اور انبیاء علیہم السلام کی زندگی کو مشعل راہ بنا کر امت کے دلوں میں اسلام کی حقانیت و صداقت جاگزین کرنے کی کوشش کریں گے تو دشمنان اسلام کی ہر سازش، اہل اسلام کے خلاف ان کا ہر اقدام اور دین اسلام کی خوبصورت اور دلنشین تصویر کو بدنما بنا کر پیش کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوگی، اور ہمارے لیے ہر مشکل آسان ہو جائے گی اور راہ کا ہر کانٹا گل و گلزار اور ہر تلخی سکون قلب کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

☆☆☆

بقیہ: اعتدال کا راستہ

اختتامیہ

آج امت کو ایسے علماء کی ضرورت ہے جو ایک طرف عقائد و اصول میں پہاڑ کی مانند مضبوط ہوں اور دوسری طرف فروع و وسائل میں حکمت، بصیرت اور اعتدال کے ساتھ کام کریں۔اصولوں میں استقامت اور وسائل میں وسعت ہی وہ متوازن راستہ ہے جو امت کو انتشار سے بچا سکتا ہے اور آنے والی نسلوں کے ایمان کی حفاظت کر سکتا ہے۔

اللہ تعالی ہمیں صحیح فہم، اخلاص، اعتدال، استقامت اور دین کی صحیح خدمت کی توفیق عطا فرمائے!

و آخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

(خطاب: ۶/جون ۲۰۲۶ء، جوگیشوری، ممبئی)

☆☆☆

یقین محکم

انسانی زندگی کا عظیم ترین سرمایہ

محمد جاوید اختر ندوی (استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں، مگر ان تمام نعمتوں میں سب سے عظیم نعمت نعمتِ ایمان ہے۔ ایمان وہ نور ہے جو دل کو زندہ کرتا، عقل کو صحیح سمت دیتا، کردار کو سنوارتا، مصیبتوں میں صبر، نعمتوں میں شکر، اور ہر حال میں اللہ پر بھروسہ پیدا کرتا ہے۔ اگر ایمان مضبوط ہو تو ایک کمزور انسان بھی دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے ثابت قدم رہتا ہے، اور اگر ایمان نہ ہو تو ظاہری قوت، مال و دولت اور اقتدار بھی حقیقی کامیابی نہیں دے سکتے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ“۔ [سورۃ الانفال:۲] (حقیقی مومن تو وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں، اور جب ان پر اللہ کی آیات پڑھی جائیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے، اور وہ اپنے رب ہی پر بھروسہ کرتے ہیں۔)

”فَمَن يُؤْمِن بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ“۔ [سورۃ التغابن:۱۱] (جو اللہ پر ایمان لاتا ہے، اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔)

ایمان یہ ہے کہ دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعمال سے اس کی گواہی دی جائے۔ ایمان بڑھتا بھی ہے اور کم بھی ہوتا ہے۔ نیک اعمال، ذکر، تلاوتِ قرآن اور اطاعت ایمان کو مضبوط کرتے ہیں، جبکہ گناہ اور غفلت ایمان کو کمزور کر دیتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”الإيمان بضع وسبعون شعبة، أعلاها قول: لا إله إلا الله، وأدناها إماطة الأذى عن الطريق، والحياء شعبة من الإيمان.“ [متفق علیہ] (ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں، ان میں سب سے بلند ’لا إله إلا الله‘ کہنا ہے، اور سب سے ادنیٰ راستے سے تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ہے، اور حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔)

جب رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ غارِ ثور میں تھے، دشمن سر پر پہنچ چکے تھے، اس نازک ترین لمحے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

”لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا“۔ [سورۃ التوبہ:۴۰] (غم نہ کرو، بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔)

یہ صرف تسلی کا جملہ نہیں تھا بلکہ کامل ایمان، کامل توکل اور غیر متزلزل یقین کا اعلان تھا۔

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی، جبکہ کفار ایک ہزار سے زیادہ تھے، سامان بھی کم تھا، مگر ایمان مضبوط تھا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ“۔ [سورۃ البقرۃ: ۲۴۹] (کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آ چکی ہیں۔)

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سارا مال اللہ کی راہ میں دے دیا۔ حضرت عمرؓ نے عدل کو عبادت بنا دیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے مال سے اسلام کی خدمت کی۔ حضرت علیؓ نے ہر میدان میں شجاعت اور اخلاص کی مثال قائم کی۔ ان سب کی قوت کا راز نہ مال تھا، نہ حکومت، بلکہ اللہ پر کامل ایمان تھا۔

ایمان ایک مسلمان کو اللہ پر کامل اعتماد اور توکل، مصیبت میں صبر اور نعمت میں شکر، خوف کے بجائے حوصلہ اور استقامت،

اخلاص، تقویٰ اور حسنِ اخلاق، دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی عطا کرتا ہے۔

آج کا مسلمان فکری یلغار، مادہ پرستی، بے دینی اور اخلاقی انحطاط جیسے فتنوں کا سامنا کر رہا ہے، ان تمام آزمائشوں کا سب سے مؤثر علاج مضبوط ایمان، صحیح عقیدہ، قرآن مجید سے تعلق، سنتِ نبوی ﷺ کی پیروی، ذکرِ الٰہی، اور صالحین کی صحبت ہے۔ ایمان وہ دولت ہے جو غلام کو رہبر، کمزور کو طاقتور، اور عام انسان کو تاریخ ساز بنا دیتی ہے۔ جب ایمان دل میں راسخ ہو جائے تو انسان دنیا کے بڑے سے بڑے طوفان کا بھی ثابت قدمی سے مقابلہ کرتا ہے۔

سب سے بڑی طاقت ایمان کی ہے، جس کو اللہ نے ایمان کی طاقت بخشی وہ دونوں جہاں میں کامیاب و کامران ہے، ایمانی طاقت رکھنے والے انسان کے لیے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو پاش پاش کرنا کچھ حقیقت نہیں رکھتا، ایمان کی طاقت ہر جگہ ہر موقع پر کام آتی ہے، انسان کے جوہر، شرافت او رخوبیاں، مصیبت اور آزمائش میں ظاہر ہوتی ہیں، تونگری اور غربت میں بھی آزمائش کا راز پوشیدہ ہے، ایمان دار دولت کو اپنے قبضہ میں رکھتا ہے اور اسے اللہ کے بتائے ہوئے صحیح راستہ میں صرف کرتا ہے، کمزور ایمان رکھنے والا دولت اور نفس کا غلام بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح عقیدہ، کامل ایمان، اخلاص، استقامت اور سنتِ رسول ﷺ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

رسید کتب

تعارف وتبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

'المجیب-رسول نمانمبر'

پھلواری شریف، پٹنہ

سید شاہ محمد وارث رحمہ اللہ جو'رسول نما' کے لقب سے مشہور تھے، شہرنگار 'بنارس' کی اک معروف تاریخی شخصیت ہیں، تصوف وسلوک کے باوصف' باکمال اہلِ علم میں ان کا شمار ہوتا ہے، اورعشقِ رسول ان کی شخصیت کا امتیاز بتایا جاتا ہے۔ آپؒ بارہویں صدی ہجری کی معروف شخصیات میں ہیں، اور خاندانی نسبت حضرت سیدنا زین العابدین کے واسطہ سے حسینی رکھتے ہیں۔آپؒ نے ملا ابراہیمؒ کے شاگردِرشید ملا احمد علی سے فیض اٹھایا، اور علمِ حدیث شیخ حیات سرہندی سے حاصل کیا۔علومِ عقلیہ ونقلیہ اور ظاہریہ و باطنیہ میں دسترس حاصل تھی۔کئی اہم کتابیں تصنیف کیں، جن میں شرح تہذیب اور شرح وقایہ پر حاشیے، ایک رسالہ اہلِ تشیع کے عقیدۂ امامت کے رد میں، اور مذاہبِ باطلہ کے رد میں 'حجت نافعہ' قابلِ ذکر ہیں۔

خانقاہِ مجیبیہ، پھلواری شریف پٹنہ کا درگاہ شاہ محمد وارثؒ سے دیرینہ انتظامی وانصرامی ربط رہا ہے۔اسی کے خراجِ عقیدت کے طور پر خانقاہ سے نکلنے والے سہ ماہی مجلہ 'المجیب' کا اک ضخیم شمارہ شاہ صاحبؒ کی حیات وخدمات کے نذر کیا گیا ہے، جو لگ بھگ ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔اہلِ علم اس مجلہ سے بخوبی واقف ہیں۔ حقیقت میں یہ تصوف اور اہلِ تصوف کا معروف ترجمان ہے، تصوف کے مسائل، تعلیمات، مناہج، شخصیات اور اس کی تاریخ اس کا خاص موضوع رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس مجلہ کی خصوصیات میں اس کے تحقیقی معیار کو بھی شمار کیا جاسکتا ہے، اور اس کی خوبصورت زبان کو بھی جس کو'ادب اہل القلوب' کا نام دیا جاسکتا ہے۔

شاہ صاحبؒ کے احوال وکوائف اور خدمات کومجلہ میں درجِ ذیل ترتیب پر مرتب کیا گیا ہے:

ابتداء میں 'لمعات' کے عنوان کے تحت بزرگ شخصیات کی تحریروں کو'گوشۂ بزرگاں' کے ضمن میں رکھا گیا ہے، اس کے بعد'سیرت وسوانح' کا موضوع ہے، پھر'تالیفات ومکتوبات' کا ذکر ہے، ایک دو مضامین 'نسبتِ اویسیت' کے حوالہ سے ہیں، پھر اساتذہ، مشائخ، خلفاء اور معاصرین کا تذکرہ ہے، آخر میں 'اوصاف وکمالات' اور پھر 'محاسن و مناقب' (منظوم) کا بیان ہے، اور اختتام 'کوائف وحالات' پر کیا گیا ہے۔

اس طرح یہ مجلہ اپنی نادر اور اچھوتی ترتیب و پیش کش کے ساتھ شاہ صاحبؒ کی حیات و خدمات کا ایک جامع تذکرہ بن گیا ہے۔

اس شمارہ کی قیمت ۴۰۰/روپیہ تجویز کی گئی ہے، حصول کے لیے رابطہ کریں:

۹۹۴۲۰۰۰۶۱۸

منظم ومؤثر مکاتب کے اصول وآداب

مفتی احمد اللہ نثار قاسمی

مسلم معاشرہ میں بڑھتی ہوئی دینی ناواقفیت نے گویا ارتداد کی راہ ہموار کردی ہے، جو مذہبی فکر اور اصلاحی عمل سے متعلق طبقہ کے لیے ایک لمحۂ فکریہ بھی ہے اور تشویش کا باعث بھی۔ ہمارا عصری تعلیمی نظام غیر دینی ہے، اور گذشتہ کئی نسلوں سے مسلم گھرانوں کا ماحول بھی حددرجہ متاثر ہے، اور ماؤں کی تربیت میں وہ بات نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی، کہ ان کی آغوش میں ہی بچوں کی اچھی خاصی دینی تربیت ہوجایا کرتی تھی؛ فرائض و محرمات، سیرت انبیاء وخلفاء راشدین، اسلامی اقدار و اخلاق وغیرہ وغیرہ ماؤں کی باتوں اور لوریوں سے بچے سیکھ لیا کرتے تھے۔

موجودہ صورتحال کی وجہ سے مکاتب کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ عصری اداروں میں تعلیم پانے والے بچوں کے لیے اب وہی دین سے بنیادی واقفیت کا واحد ذریعہ ہیں؛ لیکن مکاتب چلانے والے اور ان میں پڑھانے والے شاید خود مکاتب کی اس اہمیت سے واقف نہیں ہیں؛ اسی وجہ سے ان کے اندر وہ نظم وضبط اور جوش وجذبہ نہیں ہے جو ہونا چاہیے، الا ماشاءاللہ۔

مفتی احمد اللہ نثار قاسمی (ناظم دارالعلوم رشیدیہ حیدرآباد) نے اس کتاب کے ذریعہ مکاتب کی اصلاح کی فکر کی ہے، اور بڑی عرق ریزی کے ساتھ ذہن سازی کرنے والے عناصر کتابوں، مجلّات، رسائل اور ملفوظاتِ اکابر سے اکٹھا کیے ہیں، اور مکاتب کی افادیت کو کامل ومکمل کرنے کے لیے یہ بیش قیمت مواد جمع کیا ہے، **فجزاہ اللہ خیر الجزاء**۔

اس کتاب کے آغاز میں معلمین کی تربیت کو موضوع بنا کر ان کو صالحیت اور صلاحیت دونوں پیدا کرنے کے اسباب ومنہج کو بیان کی ہے، پھر مکاتب کی اقسام اور ان کے مقاصد کو ذکر کیا ہے،

اساتذہ کی ذمہ داریاں واضح کی گئی ہیں، مکاتب کا نظام کیسے منظم اور مستحکم بنائیں، اور ان کو مؤثر بنانے کے لیے کونسی تدابیر اختیار کی جائیں، بچوں کی نفسیات کو سمجھ کر ان کو کیسے کنٹرول کیا جائے، بالغان کی تعلیم میں اپنے دین وتقوی کی حفاظت کیسے کریں، مکاتبِ نسواں کا قیام کیسے ہو، ان کا طریقۂ کار کیا ہو، معاونین مکاتب اور بچوں کے والدین کی ذمہ داریاں کیا ہیں......، وغیرہ وغیرہ، امور کو آسان اور سہل انداز میں بتایا گیا ہے۔

کم وبیش ڈیڑھ سو صفحات کی یہ کتاب اپنی معنویت کے ساتھ حسن طباعت سے آراستہ ہے۔ 'مکتبہ احسان، لکھنؤ' سے شائع ہو کر خرید کے لیے دستیاب ہے۔ حصول کے لیے رابطہ کریں:

۹۷۹۳۱۱۸۲۳۴

بالغات اور نسواں کے مکاتب

مفتی احمد اللہ نثار صاحب کی یہ دوسری کتاب خاص طور پر مسلم خواتین اور طالبات کی تعلیم و تربیت کے نظام سے متعلق ایک جامع انتظامی و اصولی تصور کو پیش کرتی ہے۔ اس میں خواتین کی تعلیم و تربیت کے حوالہ سے نبوی ارشادات و اقدامات بیان کر کے عقلی دلائل کے ساتھ اس کی اہمیت وضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے، بطورِ نمونہ بعض خواتین اور قرونِ اولی کے خوانوادی نظام تربیت کا ذکر ہے، خواتین کے تعلیم یافتہ نہ ہونے کے نقصانات، ان کی گمراہی کے اسباب، ان کی تعلیم کی شکلیں اور طریقے، مکاتبِ نسواں کے شرائط وآداب کا مفصل ذکر کے انتظامی امور سے متعلق اہم ہدایات ومشورے دیے گئے ہیں۔

یہ کتاب 'دار العلوم رشیدیہ حیدر آباد' کے زیرِ اہتمام شائع ہوئی ہے۔

☆☆☆

قلم ایک عظیم امانت

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

اللہ تعالیٰ ہمیں قلم کی نعمت سے مالا مال نہ کرتا تو تاریخِ انسانی (History of Humanity) اور تاریخِ عالم (World History) نام کی کوئی چیز نہ ہوتی، نہ انسانی معاشرہ میں مرکزِ علم وثقافت کے قیام کی کوئی ضرورت پڑتی اور نہ متنوع ادبیات، ہمہ جہت ترقیات اور شرافت عزت کا دور دورہ ہوتا، حالانکہ یہ تمام چیزیں انسان کی نفع رسانی کا کام کرتی ہیں، اور اس وسیع وعظیم دنیا میں اس کو تمام مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں۔

ہر زمانہ میں ایک ایسی جماعت رہی ہے، جسے قلم کی امانت کا احساس نہیں، بلکہ وہ اس کے استعمال میں حد سے تجاوز کر جاتی ہے، اور صراط مستقیم سے کوسوں دور چلی جاتی ہے، اس کے قلم کا مصرف تخریب کاری کے سوا کچھ بھی نہیں، اس کے پیش نظر قرآنِ کریم کی وہ آیات نہیں ہیں، جن میں اللہ نے قلم اور اس کے ذریعہ سے جو کچھ فرشتے لکھتے ہیں اس کی قسم کھائی ہے، چنانچہ فرمان خداوندی ہے: "ن ، وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ، مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ، وَإِنَّ لَكَ لَأَجْراً غَيْرَ مَمْنُوْنٍ، وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" [سورہ القلم: ۱-۴] (نون، قسم ہے قلم کی اور اس کی جو وہ (فرشتے) لکھتے ہیں کہ آپ اپنے پروردگار کے فضل سے مجنون نہیں ہیں، اور بیشک آپ کے لیے ایسا اجر ہے جو ختم ہونے والا نہیں، اور بیشک آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر ہیں) کیا ان ربانی ارشادات سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اللہ نے قلم جیسی چیز کے اندر تعلیم وتربیت کی بنیادی صلاحیت رکھی ہے؟

یہی وہ گراں قدر قلم ہے جس کا رخ اس دور میں حق سے باطل کی طرف موڑ دیا گیا ہے، تعمیری کاموں سے تخریب کاری اور صلاح سے فساد کی طرف پھیر دیا گیا ہے، اب یہ اللہ کے دین سے جنگ کرنے اور فساد فی الارض کو عام کرنے کا ایک اہم ذریعہ بن چکا ہے، قدیم وجدید تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ انسانوں نے اپنی گھٹیا خواہشات کو پورا کرنے میں اس نعمت کا ناجائز فائدہ اٹھایا، اور اب تک اٹھا رہے ہیں۔

قلم انسان کے لیے ایک عظیم امانت ہے، تمام حالات میں اس کو تعمیری کاموں میں صرف کرنا، فساد و بگاڑ اور بے راہ روی سے بچانا انسان کا اولین فریضہ ہے، لیکن آج ہمارا مشاہدہ ہے کہ قلم کا استعمال خالق کائنات کو راضی کرنے والے کاموں میں نہیں ہو رہا ہے، حالانکہ نافرمانی اور گناہ کے کاموں کو فروغ دینے کے لیے اس کا ناجائز استعمال کرنا ممنوع ہے، پھر یہ کہ جنہیں اللہ نے علم ودین کی دولت سے نوازا، انہیں چاہیے کہ وہ اس عظیم نعمت کی حقیقت اور اس کے استعمال کے موقعوں کو نہ بھولیں، جو کتاب اللہ اور سنت رسول میں مذکور ہیں۔

☆☆☆

دعوت واصلاح

عروجِ امت کاراز

محمد نفیس خان ندوی (استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء)

تاریخِ اسلام پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ زندگی آزمائش، جدوجہد، کامیابی اور نشاۃِ ثانیہ کی ایک درخشاں داستان ہے۔ اس طویل سفر میں مسلمانوں کو کبھی سیاسی اقتدار نصیب ہوا، کبھی کمزوری اور انتشار کا سامنا کرنا پڑا، کبھی علم وتہذیب کی قیادت ان کے حصے میں آئی اور کبھی بیرونی حملوں اور اندرونی کمزوریوں نے انہیں سخت آزمائشوں سے دوچار کیا۔ تاہم پوری تاریخ میں ایک حقیقت ہمیشہ نمایاں رہی کہ یہ امت کبھی مکمل طور پر مٹ نہ سکی۔ حالات بدلتے رہے، خطے تبدیل ہوتے رہے اور زمانے گردش کرتے رہے، مگر اسلام کی روشنی اور امت کی اجتماعی زندگی برقرار رہی۔

یہی وہ امتیاز ہے جو امت مسلمہ کو دیگر اقوام سے ممتاز کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو 'خیر امت' قرار دیا اور اس کے لیے عزت وسربلندی کا وعدہ فرمایا، البتہ اس وعدے کے ساتھ آزمائش کا قانون بھی وابستہ ہے۔ جب امت اپنے دینی فرائض سے غفلت برتتی ہے، قرآن وسنت کی تعلیمات سے دور ہوتی ہے یا اخلاقی کمزوریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے تو اسے زوال، شکست اور مختلف مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ اپنے اصل سرچشمۂ ہدایت، یعنی قرآن وسنت، کی طرف رجوع کرتی ہے، اس کے اندر نئی زندگی، نئی قوت اور نئی امید پیدا ہو جاتی ہے۔

تاریخ کا غیر جانب دارانہ مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ مسلمانوں کی کمزوری کا اصل سبب بیرونی دشمنوں سے زیادہ ان کی اپنی داخلی کمزوریاں رہی ہیں۔ جب ایمان کی حرارت ماند پڑ جائے، احکامِ الٰہی کی پابندی میں سستی آجائے، اخلاص کی جگہ دنیا طلبی لے لے اور اتحاد کی جگہ اختلافات جنم لینے لگیں تو اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت بھی کم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب ایمان، علم، عدل، حسنِ کردار اور دعوتِ دین کا جذبہ امت کی پہچان بن جائے تو عزت، استحکام اور کامیابی اس کا مقدر بن جاتے ہیں۔

دوسری جانب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے مخالفین ہر دور میں امت مسلمہ کی فکری، روحانی اور تہذیبی قوت سے خائف رہے ہیں۔ اسی لیے مختلف ادوار میں اسلام کے خلاف غلط فہمیاں پیدا کی گئیں، اس کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کے مختلف ذرائع اختیار کیے گئے۔ آج بھی بعض حلقے اسلام کو جبر، تشدد اور عدمِ رواداری کا مذہب ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حالانکہ قرآنِ مجید اور سیرتِ نبوی ﷺ کا غیر جانب دارانہ مطالعہ اس تصور کی مکمل تردید کرتا ہے۔

اسلام کا بنیادی پیغام رحمت، عدل، خیر خواہی اور انسانیت کی فلاح ہے۔ قرآنِ مجید نے مذہب کے معاملے میں جبر کی صریح نفی کی ہے اور دوسروں کے عقائد و مذاہب کے احترام کی تعلیم دی ہے۔ اسی طرح قتال سے متعلق آیات بھی مخصوص تاریخی حالات اور دفاعی پس منظر سے تعلق رکھتی ہیں، جب مسلمانوں پر ظلم ڈھایا گیا، انہیں ان کے گھروں سے نکالا گیا اور ان پر جنگ مسلط کی گئی' ایسے حالات میں انہیں دفاع کی اجازت دی گئی، لیکن ساتھ ہی زیادتی سے سختی سے روکا گیا، انصاف کی پابندی کا حکم دیا گیا اور دشمن کے ساتھ بھی اخلاقی حدود ملحوظ رکھنے کی تعلیم دی گئی۔

بدقسمتی سے اسلام کے بعض ناقدین ان آیات کو ان کے تاریخی اور قرآنی سیاق وسباق سے الگ کر کے پیش کرتے ہیں، جس سے اسلام کا ایک مسخ شدہ تصور سامنے آتا ہے۔ یہ طرزِ عمل علمی دیانت کے منافی بھی اور مسلمانوں سے دشمنی کی غماز بھی، جبکہ انصاف پسند مؤرخین کا ہمیشہ سے اعتراف ہے کہ اسلام کی تعلیمات کو ان کے مکمل تناظر میں دیکھا جانا چاہیے نہ کہ سیاق سے الگ کر کے!

موجودہ دور میں جہاں ایک طرف اسلامی اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی منظم کوششیں کی جارہی ہیں' مسلمانوں کی اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے کردار، اخلاق اور علمی طرزِ عمل کے ذریعے اسلام کی حقیقی تصویر دنیا کے سامنے پیش کریں۔

عروج کی کوششیں زمینی سطح سے شروع کرنی ہوں گی، کیونکہ عروج محض جذباتی نعروں سے حاصل نہیں ہوسکتا، بلکہ عمدہ اخلاق، مضبوط کردار، علمی مکالمے، مؤثر ابلاغ اور جدید ذرائع ابلاغ کے مثبت استعمال سے ہی پورا ہوسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امت مسلمہ کا مستقبل مایوسی نہیں بلکہ امید کا پیغام دیتا ہے، بشرطیکہ وہ اپنے رب سے تعلق مضبوط کرے، قرآن وسنت کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مرکز بنائے، اپنے کردار کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالے اور دعوت و اصلاح کی ذمہ داری کو اخلاص کے ساتھ ادا کرے۔

☆☆☆

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

باسمہ تعالےٰ

تاریخ ۲۵/جولائی ۲۰۲۶ء

Date 25th July 2026

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی وتربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم وروحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری وامتیاز کا اعلان واظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون واعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات وعطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) محمد عمار حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN0000125 - STATE BANK OF INDIA, MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK

https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:

NADWATUL ULAMA

اور اس پتہ پر ارسال کریں:

Nizamat office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marge, Lucknow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر

+91-8736833376

پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کارروائی میں سہولت ہوگی۔

فجزاکم اللہ خیر الجزاء

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in